ماہنامہ

قلندرِ شعور

سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا

جون ۲۰۱۹ء

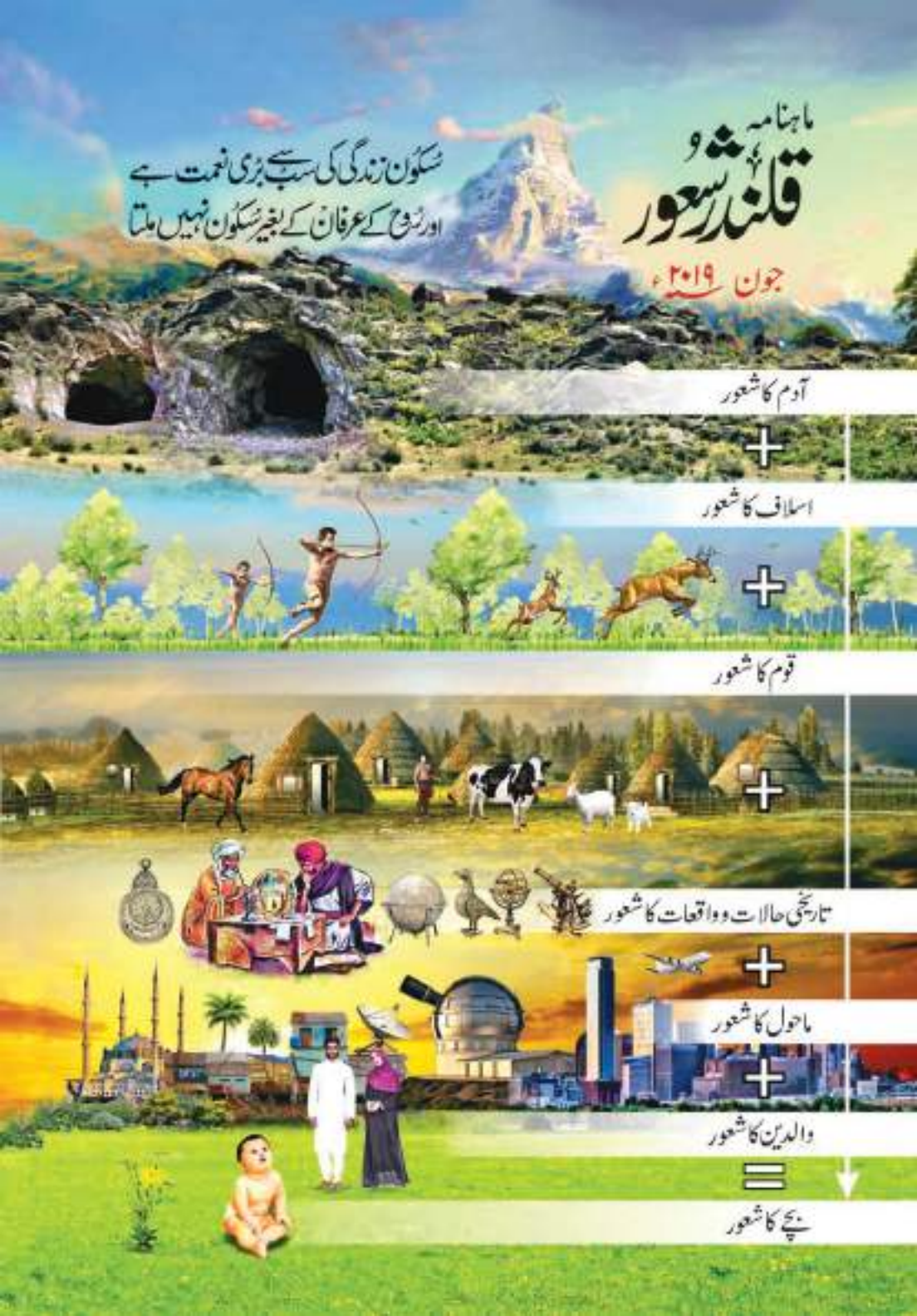

جلد 7 شمارہ 5 | جون 2019ء | رمضان ــ شوال 1440ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ شعور کراچی

قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو ــ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

باہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ــ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 70 روپے..... سالانہ ہدیہ 950 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرونِ پاکستان 60 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 213 (0) 92+

۳۸ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ	عاصی کرنالی	10
نعت رسول مقبول ﷺ	اقبالؔ عظیم	11
رباعیات	ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ	12
آج کی بات	مدیر مسئول	14
فقیر کی ڈاک	ادارہ	20
نامے میرے نام	خانوادہ سلسلہ عظیمیہ	22
عید مبارک	صبا عابد	27
مسائل کا حل	خواجہ ایس عظیمی	31
حسن کیا ہے — ؟	صبر دہلوی	35
ٹرانس ہیومن ازم کیا ہے — ؟	محمد عدنان خان (M.Sc-Applied Physics)	41
ہائے — بے چارے کی اماں مرگئی ہے	عابد محمود	47
الف — جیم	ادارہ	53
ہم سوچتے کیوں ہیں — ؟	نفیسہ شاکر	55
تقدیر معلّق — تقدیر مُبرم	سید اسد علی (MBA)	61
بے سکونی کی وجہ	شاہدہ خان (متحدہ عرب امارات)	65
مارچ 2019ء کے سرورق کی تشریح	قارئین	70
گوری کرت سنگھار	نیّر اعظم	75
مرشد کی باتیں	عائشہ خان (M.A-Mass Comm.)	81

اک لفظ تھا اک لفظ سے افسانہ ہوا ـــــ (M.A-Islamic Studies) نعیم قریشی 85

نیشاپوری ـــ بی بی فاطمہؒ ـــــ (M.A-Mass Comm.) تالیف: قرۃ العین واسطی 91

پندرہ منٹ ـــــ حماد علی شاہ 97

آنکھ میں 30 ہزار لینس ـــــ (M.A-Fine Arts) حامد ابراہیم 101

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار ـــــ (M.Sc-Botany) خالدہ زبیر 109

اقتباسات ـــــ قارئین 113

غربت، امارت ـــ غربت ـــــ (متحدہ عرب امارات) اقتدار احمد خان 115

لیموں ـــــ (M.D-Alternative Medicines) محمد سعید انور 119

اللہ میاں کے باغ کے پھول ـــ

عید کے کپڑے ـــــ (M.A-Chemistry) مہک رضا 122

اولی الالباب بچے ـــــ ادارہ 126

بھائی کے لئے بھائی کا ایثار ـــ (M.A-Mass Comm.) سارہ خان 128

کہانی کا نام ـــ؟ ـــــ حارث منظور 132

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ـــــ عظیمی خواجہ شمس الدین 135

144 Roshan Sitara ـــــ The Traveller and Lamp

149 Dr. Naeem Zafar (Ph.D.) ـــــ The Universe

152 Extracted ـــــ Prophet Ezekiel (PBUH)

157 Sarah Khan ـــــ Braces, Teeth and I

161 Bibi Anuradha (UAE) ـــــ The Clay Pot and Water

167 Sobia Abbas ـــــ A Conversation with God

172 K. S. Azeemi ـــــ Message of the Day

عاصی کرنالی

حمد باری تعالیٰ

نقش ترا فزوں فزوں، نام ترا رواں رواں
مدح تری سخن سخن، وصف ترا بیاں بیاں

جلوہ ترا نظر نظر، یاد تری نفس نفس
بات تری دہن دہن، ذکر ترا زباں زباں

ابر ترے فلک فلک، پھول ترے زمیں زمیں
چاند ترے فضا فضا، نور ترا زماں زماں

روپ ترے افق افق، رنگ ترا شفق شفق
آب ترا گہر گہر، موج تری کراں کراں

تری دمک کرن کرن، تری صبا چمن چمن
تری مہک سمن سمن، ترا کرم جہاں جہاں

تری صدائیں ساز ساز، تری نوائیں راگ راگ
تری طلب دعا دعا، تری پکار اذاں اذاں

میں نے تو رات رات بھر ذکر کیا ہے اشک اشک
میں نے تجھے سحر سحر، یاد کیا فغاں فغاں

کام مرا خطا خطا، شان تری عطا عطا
میرے خدا کرم کرم، میرے کریم اماں اماں

اقبالؔ عظیم

نعت رسول مقبول ﷺ

میں سو جاؤں یا مصطفیٰؐ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صلّ علیٰ کہتے کہتے

ستم پہ ستم سہہ گئے دشمنوں کے
حبیبِ خداؐ یاخدا کہتے کہتے

گزرتے تھے کانٹوں بھرے راستوں سے
رسول خداؐ مرحبا کہتے کہتے

ہوئے سرخ رو آپ ہر معرکہ میں
فقط ربّنا ربّنا کہتے کہتے

شہِ ہر دو عالمؐ نے نانِ جویں* سے
بھرا پیٹ شکرِ خدا کہتے کہتے

اندھیروں میں ہم نے کیا ہے اجالا
عقیدت سے نور الہدیٰؐ کہتے کہتے

دل مضطرب کو سکوں آگیا ہے
شب و روز یامجتبیٰؐ کہتے کہتے

کٹے کاش اقبالؔ اب عمر ساری
فقط نعتِ خیر الوریٰؐ کہتے کہتے

* نان جویں (جو کی روٹی)

مٹی کے مرحلے

ساقی نے پلائی ہے مجھے وہ بادہ
ہر بھید نظر آتا ہے بالکل سادہ
ہر چیز ہے چند مرحلے مٹی کے
یہ خشت سر خم ہے سر شہزادہ

’’جو چیز زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کے لئے آرائش بنایا ہے تا کہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے اور جو اس پر ہے ہم اسے چٹیل میدان کر دیں گے۔‘‘ (الکہف: ۷۔۸)

عارف کی زندگی رب کی معرفت ہے اور معرفت سے الست بربکم کی نگاہ بیدار ہوتی ہے۔

الوژن کے خول میں بند آدمی سمجھتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں۔ ’’میں‘‘ کی بساط پر نظر آنے والی شے تغیر ہے۔ ’’میں‘‘ کا تعارف ’’مٹی‘‘ سے بننے والی شکل وصورت ہے۔ اپنی موجودگی کا احساس جب معرفت کے جام سے ہم کنار ہوتا ہے تو تغیر کا نشہ ٹوٹتا ہے اور مٹی بکھر جاتی ہے۔ ادراک یقین بن جائے کہ جس نگاہ سے مخلوق دیکھ رہی ہے ــــ وہ نگاہ روز ازل کی دید ہے تو ہر زون میں رنگ رنگ شکل وصورت کا بھید ظاہر ہوتا ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی دید نے مجھے حقیقی خمار سے آشنا کیا، خمار زندگی بن گیا اور زندگی رب کی عطا کی ہوئی بصیرت ہے۔ بصیرت شاہد ہے اور مشہود بھی اور شاہد مشہود ــــ مشاہدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت نے اس بھید کو ظاہر کیا کہ تخلیق ہونے والی ہر شے مٹی کے مراحل ہیں۔ ہر مرحلہ کا نام ہے اور نام تغیر کی پہچان ہے۔ مٹی لباس ہے اور حقیقت پردہ میں ہے۔ لباس معین مقداروں سے لبریز فارمولا ہے، ہر مقدار ایک تخلیق ہے اور تخلیق مقداروں پر قائم ہے۔ مقدار کیا ہے ــــ؟ طول اور موج پر قائم حرکت ہے جو سمٹتی ہے، پھیلتی ہے، ظاہر ہوتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ طول مثلث اور موج ــــ دائرہ ہے۔ عارف چاہتا ہے کہ شراب معرفت کی لذتوں سے بہرہ ور ہو اور یہ مقام مشیت پر عمل درآمد کرنے سے عطا ہوتا ہے۔

ابدالِ حق فرماتے ہیں کہ معرفت کے خمار نے یہ راز افشا کیا کہ یہاں مٹی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ کمہار کی صراحی کی گردن جس مٹی سے بنی ہے وہ کسی شہزادہ کا سر ہے۔ کمہار مٹی سے پیمانے بناتا ہے۔ اس نے صراحی بنانے کے لئے مٹی کو پیمانہ میں ڈھالنا چاہا، جو مٹی وہ لے کر آیا وہ کبھی کسی شہزادہ کا سر تھی۔

آج کی بات

جب کچھ نہیں تھا ــــ ایک واحد ہستی موجود تھی۔ ہستیٔ مطلق نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پہچان کے لئے وجود اور وجود کے لئے ہستی کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ ہستی نے اپنی موجودگی کو ظاہر کیا تو ایک سے زائد رخ متعین ہوئے جن کو ہستی نے ظاہر، باطن، حاضر اور غیب کا نام دیا۔ یہ چار بنیادی رخ تخلیق ہونے والی ہر شے پر محیط ہیں۔ ان کے تعین میں یہ امر تفکر طلب ہے کہ کوئی ہستی تھی، ہے اور رہے گی جو اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے اور باطن ہے ــــ پسند فرمایا کہ میری موجودگی کا مظاہرہ ہو۔

حدیث قدسی ہے،

''میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں۔''

پہچان کا انحصار دو نکات پر ہے۔

۱۔ ابتدا، انتہا، اول اور آخر متعین ہوں۔

۲۔ چھپی ہوئی ہستی کو پہچاننے کے لئے ہستی کے علاوہ کوئی دوسرا موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ نے کُن فرمایا، ارادہ میں مخفی پروگرام کے تحت کائنات پوری تفصیلات کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ حکم ہوا.....

''کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب ــــ؟''

آواز سے حس بیدار ہوئی۔ پہلے مرحلہ میں ذہن نے سوال کیا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس نے مخاطب کیا۔ تجسس سے آواز نگاہ بنی۔ نگاہ نے لامحدود ہستی کو دیکھا، نگاہ ادراک میں منتقل ہوئی، ادراک کی گہرائی سے مخلوق نے خالق کو محسوس کیا ــــ محسوسیت

سے آگہی ملی کہ جس نے مجھے مخاطب کیا ہے، وہ رب ہے۔ رب نے مجھے پیدا کیا اور میں اس کا بندہ اور محتاج ہوں۔ احساس ہونے پر مخلوق ''میں ہوں'' کی نفی کرتے ہوئے خالق کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوگئی۔

کس نے آواز دی ــــ علم الیقین ہے۔

آواز کی جانب دیکھنا ــــ عین الیقین ہے۔

ہستی کو محسوس کرنا ــــ اپنی نفی ہے اور اپنی نفی ــــ حق الیقین ہے۔

قالوا بلیٰ ــــ خالق کی ہستی کا اثبات ہے۔

خالق کائنات کی معرفت لاشعور پر عمل سے ملتی ہے اور لاشعور کی پہلی تحریک اپنی نفی اور خالق کا اثبات ہے۔ نفی اثبات ــــ کائنات کا پہلا سبق ہے۔

•• ———— ••

پہچان کا تعلق حس سے ہے۔ سماعت اپنے درجہ میں ایک احساس ہے اور بصارت، ادراک، محسوس کرنا اور گویائی اپنے اپنے درجہ میں احساس ہیں یعنی احساس ایک طرف نفی اور دوسری طرف اثبات ہے۔ احساس میں فرد خود کو محسوس کر کے دوسروں کو خود سے الگ دیکھتا ہے۔ احساس اس وقت ہوتا ہے جب دو شے ایک ہوں اور ایک ہو کے دو ہو جائیں۔

مثال: ماں نے بچہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ایک طرف احساس ہوا کہ میں الگ ہوں اور بچہ الگ ہے لیکن ہاتھ رکھنے سے بچہ کی لہریں ماں کے اندر داخل ہوئیں، ماں مغلوب ہوئی اور بچہ کا احساس غالب ہوگیا۔ احساس کی بدولت ماں نے کہا کہ یہ میرا بچہ ہے یعنی میں الگ ہوں اور بچہ الگ ہے۔

۱۔ ماں نے اپنی نفی کی اور بچہ کا اثبات کیا۔

۲۔ دونوں کی نفی کر کے دوری کا اقرار کیا۔

ہم کسی کو اس وقت دیکھتے ہیں جب خود کو نہیں دیکھتے اور جب خود کو دیکھتے ہیں تو دوسرا موجود ہو کر بھی نظر نہیں آتا۔ قانون ہے کہ جس کو ہم نے دیکھا، اس کا عکس منتقل

ہوا ــــ ہمارا احساس مغلوب اور اس کا غالب ہوگیا۔ پلک جھپکی اور احساس میں دوری پیدا ہوئی تو ہم نے کہا کہ یہ پھول ہے اور میں آدم ہوں۔ احساس میں ایک مرحلہ ضم ہونا ہے اس لئے احساس کی دنیا میں پھول اور آدم ایک ہیں۔

پانی کا ذائقہ پانی پی کر بتایا جاتا ہے۔ پانی ــــ ذائقہ اور پانی پینے والا احساس کی دنیا میں ایک ہیں اس لئے سب نے ایک دوسرے کو قبول کیا اور فرد کی پیاس بجھی۔

احساس کا تعلق دوئی سے ہے۔ شے کو اس وقت محسوس کیا جاتا ہے جب وہ ہم سے الگ ہو۔ الگ نہ ہو تو دوری زیر بحث نہیں آتی۔ ایک فرد عطر بیز ماحول میں بیٹھا ہے، عطر لگاتے وقت اس نے خوش بو محسوس کی، کچھ دیر بعد عطر کا احساس مغلوب ہوگیا۔ وجہ یہ ہے کہ عطر کی مہک وجود میں سرایت کرتی ہے تو فرد اور مہک میں مشترک مقداریں ایک ہو جاتی ہیں۔ اب خوش بو نہیں آتی۔ کمرے میں دوسرا فرد داخل ہوتا ہے، خوش بو کی لپٹیں شامہ سے ٹکراتی ہیں، وجود میں سرایت کرتی ہیں اور وہ خود کو لطیف محسوس کرتا ہے، تھوڑی دیر بعد اسے خوش بو نہیں آتی۔ کیا خوش بو ختم ہوگئی ــــ؟ کمرے میں موجود افراد کو کیوں محسوس نہیں ہو رہی ــــ؟ باہر سے آنے والا فرد خوش بو کیوں محسوس کرتا ہے اور پھر محسوس نہیں کرتا ــــ؟

•• ———— ••

علم کا پہلا درجہ لاعلمی ہے۔ لاعلمی کے بغیر کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔ ہر حقیقت جس سے ہم واقف اور ناواقف ہیں، ایک وجود ہے۔ وجود کسی کے لئے ہے اور کسی کے لئے نہیں ہے لیکن موجود ہے۔ انکار اور اقرار شے کی موجودگی کے سبب زیر بحث آتے ہیں۔ نہیں ہے میں نہیں کے بعد ہے کہنا شے کی نفی نہیں، لاعلمی کا اقرار ہے۔

نفی اور اثبات کے قانون پر عمل کرنے سے مشاہدہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

صوفی خواتین وحضرات لاعلمی کی معرفت کو ''علم لا'' اور علم کی معرفت کو ''علم الا'' ''

کہتے ہیں۔ لا کے معنی ''نہیں'' اور الّا کے معنی ہیں ''مگر ہے''۔ الّا میں ہر شے کی نفی کے ساتھ حقیقت کا اثبات ہے۔ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

''جب کوئی طالبِ روحانیت لاشعور یعنی ''لا'' سے متعارف ہونا چاہتا ہے تو اسے خارجی دنیا کے تمام توہمات، تصورات اور خیالات کو بھول جانا پڑتا ہے۔ اس کو اپنی ذات یعنی اپنے ذہن کی داخلی گہرائیوں میں فکر کرنی چاہئے۔ فکر ایک ایسی حرکت ہے جس کو ہم کسی فکر کی شکل اور صورت میں محدود نہیں کر سکتے۔ ہم اس فکر کو ''فکرِ لا'' کہتے ہیں۔ یعنی ہمارے ذہن میں تھوڑی دیر کے لئے یا زیادہ دیر کے لئے ایسی حالت وارد ہو جائے جس میں ہر زاویہ لاعلمی کا ہو۔ اس فکرِ لا کو ہم عمل استرخا* کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔ عمل استرخا کے تواتر سے ذہن کے اندرونی دائرے ہر فکر سے خالی ہو جاتے ہیں، گویا اس وقت ذہن فکرِ لا میں مستغرق ہو جاتا ہے اور اس استغراق میں لاشعور کا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔''

روحانیت میں فکر کے معنی کھوج ہیں۔ ذہن کثرت کے پس پردہ وحدت میں مرکوز ہو جائے تو فکرِ لا حاصل ہوتی ہے۔

• • ——————— • •

جب تک بندہ اپنے علاوہ دوسری شے نہیں دیکھتا ـــ وہ خود کو بھی نہیں دیکھتا۔ اپنی پہچان اپنے علاوہ کسی کو دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال آئینہ ہے۔ آئینہ نہ ہو تو فرد خود کو نہیں دیکھ سکتا۔ آئینہ میں خود کو دیکھ کر اسے اپنی موجودگی کا یقین ہوتا ہے۔

ایک (۱) کے عکس کو الگ شناخت کے لئے ہم دو (۱+۱) کا نام دیتے ہیں۔ جب کہ ایک کے بعد جتنے ایک بڑھائے جائیں ـــ سب ایک ہیں۔ دو، تین، چار اور پانچ شناخت کو قائم رکھنے کے لئے ہیں۔ ایک کو ایک اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد دو، تین، چار اور پانچ ہیں۔ پہچان کے لئے دوسرے کی موجودگی ضروری ہے۔

---

*استرخا (تاریکی میں پلک جھپکائے بغیر ذہن کا ایک نقطہ پر مرکوز ہونا)

آئینہ جن ذرّات سے بنا ہے، ہر فرد میں وہ ذرّات موجود ہیں۔فرق مقداروں میں کمی بیشی کا ہے۔آئینہ فرد سے الگ ہے لیکن آئینہ میں فرد کی مقداریں موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ جو مخلوق آئینہ کے سامنے جاتی ہے، آئینہ عکس قبول کر کے دکھا دیتا ہے۔

• • ——————— • •

شعور کا پہلا قدم سماعت کا حرکت میں آنا ہے۔ یہ قدم لہروں کو آواز میں منتقل کر کے سماعت تک پہنچاتا ہے۔خیالات لہروں میں اور لہریں دائرہ کی شکل میں کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ذہن کی فریکوئنسی لہروں کے قریب ہوتی ہے تو لہریں شعور کی سکت کے مطابق آواز بنتی ہیں۔ ذہن آواز کی فریکوئنسی سے ہم آہنگ ہو جائے تو آواز — مشاہدہ بن جاتی ہے۔حرکت کے لئے ضروری ہے کہ حرکت دائرہ میں ہو۔ دائرہ — سمتوں کی نفی کر کے اس سمت کا اثبات کرتا ہے جس میں اول اور آخر، ظاہر اور باطن ایک ہیں۔اللہ تعالیٰ نے سمتوں کی نفی کو ''احد'' فرمایا ہے۔

''کہو اللہ احد ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔اس کی اولاد نہیں نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور اس کا کوئی خاندان نہیں۔'' (الاخلاص:۱۔۴)

نفی اور اثبات کی تفہیم پڑھئے۔

۱۔ احد کے معنی اول، آخر، ظاہر اور باطن ایک ہونا ہے۔

۲۔ صفتِ صمد سے مراد بے نیازی ہے۔ بے نیازی میں ڈائی مینشن سے ماورا ہونے کا اعادہ ہے۔

۳۔ نسل کی افزائش کے لئے دو رخ ضروری ہیں جب کہ خالق کائنات اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات — رخوں (ڈائی مینشن) سے آزاد ہے۔

• • ——————— • •

تخلیق کائنات کے بعد حواس کی منتقلی میں فرد کو پہلی معرفت لاعلمی کی حاصل ہوئی۔ ''الست بربکم'' کی آواز پر اپنے ہونے کا احساس ہوا لیکن یہ احساس لاعلمی کے درجہ میں

تھا۔خبر نہ ہو کہ میں کون ہوں تو ہونا نہ ہونا برابر ہے۔خالق کی آواز سماعت بنی، نگاہ نے ہستی کا مشاہدہ کیا اور مخلوق نے اعتراف کیا کہ میں نہیں ہوں ـــ مگر اللہ ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

''کوئی نہیں ہے ـــ مگر اللہ۔حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔''

سالک کے اندر جب تک ''میں'' کا علم غالب ہے، وہ آسمانی علوم نہیں سیکھ سکتا۔

ہم کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں تو پہلے فکشن حواس کی نفی کرتے ہیں پھر حقیقت کا اقرار ہوتا ہے۔

خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی بعثت کے زمانہ میں لوگ بتوں کو خدا مانتے تھے۔لا الٰہ کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ بت معبود نہیں مگر اللہ معبود ہے۔اولی الالباب ہستیاں لا الٰہ کی تشریح بیان کرتی ہیں کہ شعوری علوم میں اللہ کے جاننے کی جو طرز ہے ہم اس کی نفی کرتے ہیں اور اللہ کو اس طرح اللہ تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ خود کو اللہ کہتا ہے۔ محمد رسول اللہؐ ـــ اللہ کے پیغامبر ہیں۔حضرت محمدؐ نے اللہ کو جس طرح جانا اور جس طرح بتایا ہم اسی طرح اللہ کو تسلیم کرتے ہیں۔نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ پہلے ہم نے اپنے علم کی نفی کی پھر علم کا اثبات کیا۔علم کی نفی کی تو اپنی نفی کی اور جب اپنی نفی کی تو اللہ کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔اللہ اپنے محبوبؐ سے فرماتا ہے،

''کہو اللہ احد ہے۔وہ بے نیاز ہے۔اس کی اولاد نہیں نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور اس کا کوئی خاندان نہیں۔'' (الاخلاص:۱۔۴)

اللہ حافظ

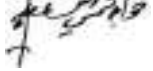

فقیر کی ڈاک

تفکر ـــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ غور وفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ـــ عرفان نفس اور معرفت الٰہی ہے۔ ’فقیر کی ڈاک‘‘ اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن کی پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

میں طویل عرصہ سے سلسلہ میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے اندر روحانی صلاحیت میں اضافہ ہو۔ مختلف خدمات انجام دیتا ہوں اور اپنا کام دیانت داری سے کرتا ہوں لیکن اسباق میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔ اسباق میں تعطل کی وجہ کیا ہے اور کمی کو کیسے دور کروں ـــ؟ شکریہ، احمد شیراز

برخوردار احمد شیراز صاحب، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

سلسلہ میں بیعت ہونے کے ایک عرصہ گزرنے کے باوجود اسباق میں پابندی اور باقاعدگی پیدا نہ ہونے کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ۱۔ مستقل مزاجی کا فقدان ۲۔ اسباق کی ادائیگی میں عدم دل چسپی

اسباق کی پابندی ایسا عمل ہے جسے آپ کو اپنی قوت ارادی سے خود سرانجام دینا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا آپ کے لئے کچھ نہیں کرسکتا کیوں کہ قوت ارادی کو بروئے کار لانا خالصتاً انفرادی عمل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ میں قوت ارادی نہیں۔ اگر قوت ارادی نہ ہو تو آپ دیگر مشاغل بشمول معاشی معاملات، باقاعدگی سے کیسے انجام دیتے ہیں؟ ان مصروفیات میں تسلسل کیوں ہے؟ ان میں ناغہ کیوں نہیں ہوتا ـــ؟

بنیادی وجہ یہی ہے کہ دل چسپی نہیں ہے، مستقل مزاجی نہیں ہے۔ عمومی طور پر مرشد سے محبت وعقیدت کے اظہار میں زبانی جمع خرچ تو بہت ہے لیکن عملی طور وہ کوشش نہیں ہوتی جس سے محبوبیت کا اظہار ہوتا ہو۔

غور سے سمجھئے ـــ سلسلہ میں رہتے ہوئے مرشد کی خدمت یا دیگر خدمات انجام دینے سے شعوری صلاحیتوں

میں اضافہ ہوسکتا ہے لیکن روحانی طور پر ان کا کوئی تعلق نہیں ! مرشد سے قلبی و روحانی تعلق میں مستحکم ربط اور نسبت صرف اِس عمل سے پیدا ہوتی ہے کہ آپ اسباق کی کس قدر پابندی کرتے ہیں۔

سلسلہ میں کسی ذمہ داری کا ملنا یا کسی خدمت کے انجام دینے کی سعادت حاصل ہونا — مرشد کی نظرِ کرم تو ہے لیکن ذمہ داری کے ملنے کو یہ سمجھ لینا کہ میں کچھ بن گیا ہوں یا میرے اندر یہ صلاحیت تھی تو اس نوعیت کا کام ملا ہے — کوتاہ نظری اور کج فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔

دیکھیں — شعوری مصروفیات میں منفی قوتیں اس لئے مزاحمت نہیں کرتیں کہ جس قدر شعوری غلبہ میں اضافہ ہوگا، مرید لاشعوری کیفیات سے دور ہوجائے گا۔ لیکن جب آدمی دوسرے رخ پر جانے کی سعی کرتا ہے تو یہی منفی قوتیں اس کے راستہ میں رکاوٹیں یا مزاحمت پیدا کرتی ہیں۔ آپ طے کرلیں کہ کچھ بھی ہوجائے اسباق و مراقبہ میں ناغہ نہیں کرنا — خود پر جبر کرکے بیٹھ جائیں۔ عادت نشہ کی بھی ہوتی ہے، عادت کبوتر بازی کی بھی ہوتی ہے اور اگر ذہن لگ جائے تو اسباق کی ادائیگی کی بھی عادت ہوجاتی ہے۔

قوت ارادی کو مستحکم کرنے کے لئے ہمہ وقت یا حیی یا قیوم کا ورد کریں۔ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کریں۔ باوضو رہنے کے ساتھ ساتھ نماز عشا اور نماز فجر کی باقاعدگی سے قوت ارادی میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ بات بطور خاص سمجھ لیں کہ اصل زندگی لاشعوری ہے اور اس کی مثال اللہ کے ارشاد کے مطابق،

''ہر نفس کو موت کا ذائقہ ضرور چکھنا ہے۔'' (آل عمران: ۱۸۵)

حقیقت یہ ہے کہ ''شعور'' لاشعور کے طفیلی حواس ہیں۔ طفیلی حواس سے مراد ہے کہ شعور ہمیشہ لاشعور کے تابع ہوتا ہے لیکن اللہ کے قانون کے مطابق شعور کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ لاشعوری حواس، واردات و کیفیات کو صراط مستقیم کے مطابق قبول کرے یا اس کے خلاف قبول کرکے عمل کرے۔ انہی دو رخوں میں ایک طرز فکر رحمانی ہے اور — صراط مستقیم سے ہٹی ہوئی دوسری طرز فکر شیطانی ہے۔

اللہ نے انسان کو مکلّف مخلوق بنایا ہے۔ انسان کی دو پرت ہیں ایک پرت خود انسان اور دوسری طرف آدمی ہے۔ اسی لئے آدمی کو حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے یعنی بولنے والا، جواب دینے والا۔ یہ طرز کلام شعوری ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو روشن ضمیری عطا فرمائے۔ آمین

دعا گو، عظیمی (31، مارچ 1989ء)

نامے میرے نام

خواتین وحضرات قارئین — السلام علیکم، ذہن میں ''ماہنامہ قلندر شعور'' کے مطالعہ کے بعد کوئی ایسا خیال آتا ہے جس کا جواب نہ ملنے سے تشنگی بڑھ جاتی ہے۔ آپ لکھئے — اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ انشاءاللہ جواب شائع کیا جائے گا۔

وفا انصاری واراکین مراقبہ ہال (بحرین): مرشد کریم کی سرپرستی میں رسالہ ''ماہنامہ قلندر شعور'' روحانی علوم سے آگہی اور غیر جانب دار طرز فکر کے فروغ کے لئے جس طرح سے کوشاں ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ رسالہ کا اعجاز ہے کہ اس کی حیثیت علمی، ادبی اور روحانی لحاظ سے مستند ہے۔ اپریل 2019ء کے شمارہ میں اردو میں ''آج کی بات'' کا اسی شمارہ میں انگریزی میں ترجمہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ بحرین مراقبہ ہال کے تمام اراکین اور دیگر کی جانب سے اس اقدام کو سراہا گیا۔ اس سے ''آج کی بات'' پر تفکر اور مذاکرہ میں آسانی ہوئی۔ ہماری طرف سے آپ کا بے حد شکریہ اور ''ماہنامہ قلندر شعور'' کی ٹیم کو مبارک باد۔

محمد عثمان (کراچی): ''ماہنامہ قلندر شعور'' کی اشاعت مجھ جیسے روحانیت کے شوقین پر احسان ہے۔ مادہ پرستی کے اس بدترین دور میں یہ ایک بڑی خدمت ہے۔ اہم کالم عظیمی صاحب کا اداریہ ہے جسے میرے گھر میں شوق سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ مجھے مراقبہ، سانس کی مشقیں اور جسم مثالی سے متعلق معلومات میں بہت دل چسپی ہے۔

ثمرین ظفر (سرگودھا): ''ماہنامہ قلندر شعور'' شوق سے پڑھتی ہوں۔ بہت سی باتیں سمجھ میں آتی ہیں اور ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ خواب کی تعبیر میں اکثر پڑھا ہے کہ آپ فرماتے ہیں قرآن کریم پڑھ کر مرحوم کو ایصال ثواب کریں۔ کیا قرآن کریم ترجمہ کے بغیر پڑھنے کا فائدہ ہوتا ہے؟ کیا اس طرح ایصال ثواب کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس سے مرنے والے کی تکلیف میں کمی آتی ہے؟

★ ہم کوئی بھی زبان پڑھتے یا بولتے ہیں اگر اس کے معانی سے بے خبر ہوں تو کیا مخاطب مطمئن ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم عربی زبان میں وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ آپ انگریزی قاعدہ میں ABCD یاد کر کے مخاطب کو کوئی بات سمجھا سکتے ہیں؟ مثلاً جو شخص اردو نہیں جانتا اس سے آپ کہیں کہ پانی پلا دو۔ کیا وہ بات سمجھ جائے گا؟ اگر

ہم کوئی دوسری زبان نہ جانتے ہوں اور اس سے اپنی مادری زبان میں بات کریں، کیا یہ عمل قابل قبول ہے — ؟

آصف علی (چارسدہ): دعا ہے کہ آپ کی صحت پر رحمت وفضل وکرم خداوندی ہو۔ مجھے لکھنے کا شوق ہے اور 1997ء سے لکھتا ہوں۔ چارسدہ کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے۔ تصور سے متعلق پشتو میں بھی تحریر کیا ہے۔ گزارش ہے کہ اگر میں کوئی تحریر بھیجوں تو مہربانی فرما کر اسے شائع کریں۔ دعا کا طالب۔

★ اگر زبان کے قواعد وضوابط کے ساتھ قابل اشاعت ہو تو انشاءاللہ شائع ہوسکتا ہے۔

عبدالرحمٰن (کوٹ ادو): بندہ کو ماحول کے زیر اثر رہ کر تفکر کی عادت نہ ہو تو اس کا ذہن کیسے کھلے گا؟ اور تفکر کے تحت آنے والے خیال پر علم کیسے ہوگا کہ آنے والا خیال درست ہے یا غلط — ؟ راہ نمائی فرمائیے۔

★ پڑھے لکھے خواتین وحضرات سے علمی گفتگو کریں۔ گفتگو میں سوال وجواب بھی ہوں۔

عمر عظیم (لاہور): مئی 2019ء میں پیراسائیکالوجی کے تحت علاج کا سلسلہ شروع کئے جانے کے بارے میں پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ یقین ہے کہ خواب کی تعبیر کی طرح یہ سلسلہ علاج کے ساتھ علم میں بھی اضافہ کا باعث ہوگا۔ اللہ کے دوست ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو صحت اور مزید ہمت عطا فرمائے، آمین۔

محمد علی (کراچی): گل نسرین صاحبہ نے کہانی کی شکل میں زندگی کے ادوار اور قوانین کو روانی سے بیان کیا ہے۔ ماحول میں بہت سی آوازیں ہیں۔ کیا ہر آواز تفکر کرنے پر روشنی سے متعارف کراتی ہے؟ میں یہ سمجھا ہوں کہ اس سے مراد ضمیر کی آواز ہے۔ کیا میں نے صحیح سمجھا؟

★ سوالات کی مناسبت سے آپ نے صحیح سمجھا۔

عنبر فاروقی (فیصل آباد): سلیقہ سے متعلق مضمون میں کیا خوب بات کہی ہے کہ غلط اردو بولنے پر شرمندگی نہیں ہوتی لیکن انگریزی کا لفظ غلط ہو جائے تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ غلام ذہن کی نشانی ہے۔

شاہ رخ (کراچی): مصروفیت بہت ہے لیکن میں ''ماہنامہ قلندر شعور'' پڑھنے کے لئے وقت ضرور نکالتا ہوں۔ اس کے لئے وقت نکالنا دراصل اپنے لئے وقت نکالنا ہے۔ ہر طرف انتشار، شک اور بے یقینی ہے۔ اس رسالہ میں یک سوئی ہے، اتفاق ہے، اتحاد ہے، محبت ہے اور تفکر ہے۔

زرینہ (اسلام آباد): برسات میں نظیر اکبر آبادی کی ''برسات کی بہاریں'' نے رم جھم کا لطف بڑھا دیا۔ جن شعرا کے کلام میں گہرائی ہوتی ہے، وہ ہر کیفیت اور منظر کو بیان کرتے ہیں۔ ایسے کلام شائع کئے جانے چاہئیں۔

عمیر احمد (سرگودھا): ''ماہنامہ قلندر شعور'' میں اولیائے کرام کی سوانح حیات اور تعلیمات کو بیان کرنے

کا انداز مختلف ہے۔ تجویز ہے کہ اب تک اولیائے کرام کے جتنے مضامین شائع ہو چکے ہیں، انہیں کتابی صورت دی جائے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ کی نوجوان سے گفتگو کہ کیا تم نے اللہ کو دیکھا ہے؟ نوجوان بولا، کیا تم نے نہیں دیکھا—؟ اس جواب کو پڑھ کر میں سکتہ میں آ گیا۔

شمع سلطانہ (کراچی): عابد محمود صاحب کی قلم پر دسترس بڑھ گئی ہے ماشاءاللہ۔ ''کام کی زکوٰۃ'' لکھ کر انہوں قارئین کو راہ دکھائی ہے کہ جس طریقہ سے ہو سکے خلق خدا کی خدمت کریں۔ ان کی تحریر ''ادھورا'' نے بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ اس تحریر نے ہمیں رلا دیا۔ اچھے مصنف کی کامیابی ہے کہ وہ قارئین کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

محمد زاہد (حیدرآباد): کبوتروں کی نامہ بری پر مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر ہلکی پھکی اور معلوماتی تھی۔ کبوتر میں کیا کوئی خاص صلاحیت ہے کہ نامہ بری کا کام صرف اس سے لیا جاتا ہے—؟ عاصم صاحب کا مضمون اچھا لگا۔ زاہدہ صاحبہ کا ''روشن ذہن کردار'' والدین کو خاص طور پر پڑھنا چاہئے۔

★ آپ سے سوال ہے کہ صلاحیت کے بغیر کیا کوئی کام ہو سکتا ہے—؟

اسد داؤد (کراچی): حماد علی شاہ کی تحریر نیا اضافہ ہے۔ ''اونچ نیچ کا پہاڑ'' معیاری تحریر ہے۔ امید ہے کہ وہ باقاعدگی سے لکھیں گے۔ مجموعی طور پر رسالہ کا معیار بہترین ہے۔ ہر مضمون سے میں کچھ نہ کچھ سیکھتا ہوں۔

★ ——————— ★

اپریل 2019ء میں ''آج کی بات'' پر منتخب تفکر پیش خدمت ہے:

ساجد علی (سوات): ''آج کی بات'' میں حرارت کی روحانی تشریح بیان کی گئی۔ میں سائنس کا طالب علم ہوں۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ سائنس بے شک تحقیق میں مگن ہے لیکن علم روحانیت میں الوژن نہیں ہے۔

سبین قریشی (لیہ): تحریر ہے کہ پانی میں حرکت ہے اور حرکت کا تعلق حرارت سے ہے۔ حرارت کا ایک رخ ٹھنڈک اور دوسرا حدت ہے۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرارت وہ تخلیق ہے جس کی وجہ سے مخلوقات میں تغیر پیدا ہوتا ہے؟

★ کیا آپ اس نتیجہ سے مطمئن ہیں—؟

ارم (کراچی): دباؤ پر غور و فکر سے سمجھ میں آیا کہ دباؤ کا تعین غیب سے ہے۔ دباؤ غیب سے آنے والی حرکت (اطلاع) کا وہ حصہ ہے جو فرد اور اس کی شعوری کیفیت بن جاتا ہے۔ دباؤ ثقل ہے۔ شے دباؤ کے نتیجہ میں ادراک بنتی ہے۔ سمجھنا چاہتی ہوں کہ دباؤ کیا ہے—؟

★ ہم زمین میں آم کی گٹھلی دباتے ہیں درجہ بہ درجہ گٹھلی دباؤ کو باہر خارج کرتی ہے۔ نتیجہ میں درخت نمودار ہوتا ہے۔ ماشاءاللہ آپ ذہین ہیں، بتائیے کہ اس کی ایکویشن کیا ہے—؟

محمد عزیر (کراچی): آپ نے فرمایا کہ ہر مخلوق حرارت کے ایک درجہ کا نام ہے۔ حرارت کے ایک درجہ کے معنی انجماد کا درجہ ہے۔ کیوں کہ جب تک شے جمے گی نہیں، نظر نہیں آئے گی۔ پانی میں بھی انجماد کا ایک لیول ہے ورنہ پانی اڑ جائے گا۔ جمنے کے معنی اسپیس کا احاطہ ہے۔ ہمیں اس جمود سے واقف ہو کر اس تہ تک پہنچنا ہے جس میں جمود نہیں ہے۔

محمود حسین (لاہور): آپ نے قرآن کی آیت میں بجلی کا فارمولا بیان کر دیا، یہ وہی شخص بیان کر سکتا ہے جس نے اللہ کے عطا کردہ علوم سے واقف ہونے کے لئے جدوجہد کی اور اللہ نے اپنا عرفان اسے عطا فرمایا۔ آپ نے موجودہ دور کے بچوں، نوجوانوں اور بزرگوں کے لئے راہ کا تعین کیا ہے کہ وہ قرآن کریم کو اس طرح سے سمجھ کر پڑھیں۔ کوئی شک نہیں کہ جہاں سائنس کی حد ختم ہوتی ہے، وہاں سے روحانی علوم کا آغاز ہوتا ہے۔ جاننا چاہتا ہوں کہ روحانیت کی زبان میں منفی اور مثبت چارج کیا ہیں — ؟

★ **رد کرنا اور قبول کرنا منفی اور مثبت چارج ہیں۔**

سلیمان عمر (اسلام آباد): ''آج کی بات'' کو ایک سے زائد بار سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سرسبز درخت سے آگ پیدا ہونے کی روحانی توجیہ میں تفکر کے گہرے نکات ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''ایک طرف تیل یعنی چپک نے اجزا کو جوڑ رکھا ہے، دوسری طرف اسی تیل کی وجہ سے اشیا میں جلنے یا راکھ ہونے کا وصف موجود ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ ایک شے کے دو رخ ہیں۔ تیل جوڑ کر رکھتا ہے اور جلا کر راکھ بھی کر دیتا ہے۔ خود تیل کیا ہے، اس پر تفکر کر رہا ہوں۔

بی بی ہاجرہ (کراچی): ہر شے کی بنیاد پانی ہے۔ جسم کو متحرک رکھنے والا خون پانی ہے۔ پانی میں اللہ کی صفات ہیں۔ پانی میں مقداریں ہیں، مقداریں روشنی ہیں، روشنی نور ہے۔ اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔

ڈاکٹر ندا (لاہور): تیل ہر شے میں موجود ہے، جس شے سے تیل نکلتا ہے، وہ خشک ہو کر بکھر جاتی ہے۔ گنے کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سردی یا گرمی میں پانی نہ پینے سے جسم میں خشکی پیدا ہو تو چہرے اور ہاتھوں پر سلوٹیں ظاہر ہوتی ہیں۔

صبا عابد

عید مبارک

وہ قرب جو رگِ جاں سے منسلک ہے اس کی روشنی میں سات اور پھر پانچ تکبیریں پڑھ کر مجھے ادراک ہوا ہے کہ اللہ کی ذات وصفات کا بیان ممکن نہیں ـــ اللہ ہر تعریف سے ماورا ہے۔

بچہ سے کیا دور ہوئی کہ دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ آنکھیں بھیگی ہوتیں اور پلکیں اللہ کے حضور سجدہ ریز رہتیں۔ ہر وقت بچہ کی سلامتی کی دعائیں مانگتی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا اس سوال نے ماں کو بے چین کر دیا۔ وہ ایک بچہ کی ماں تھی۔ پہلے شوہر کی موت ہوگئی تھی۔ نکاح ہوا تو شوہر شکی اور ظالم تھا۔ اس نے حقارت سے بچہ کو دیکھتے ہوئے کہا کہ میں اس لڑکے کو گھر میں نہیں رکھ سکتا۔

یتیم ہے، کہاں جائے گا؟ ماں نے کرب سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے التجا کی۔

میں نے فیصلہ سنا دیا ہے۔ سوتیلے باپ نے بے دردی سے بات ختم کر کے لڑکے کو گھر سے نکال دیا۔ ماں نے لختِ جگر کو بے آسرا ہوتے دیکھا تو دل پر درد کے ہزاروں کوڑے برس گئے۔ روایات کے ہاتھوں بے بس جانتی تھی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور روتے ہوئے بچہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا۔

عرب قبائل جہالت اور درندگی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے۔ بیوی کی حیثیت محض زر خرید غلام کی تھی۔ عورت کی عزت تھی نہ حقوق، حیوانات جیسا سلوک تھا۔ اقوام عالم میں کوئی بھی اسے تقدس واحترام کی چادر اوڑھانے کو تیار نہیں تھا۔

عورت سے متعلق بنیادی نظریہ تھا کہ وہ گناہ کی ماں، بدی کی جڑ اور جہنم کا دروازہ ہے۔ مصائب کا آغاز اس سے ہوا ہے لہٰذا وہ شیطان کی آلہ کار ہے۔ دنیا والوں پر مصیبت لائی ہے۔ اس کی ندامت کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔

صحرا کی رات سرد اور ٹھٹھرا دینے والی تھی۔ چھوٹے بچہ نے صحرا کی مٹی میں خود کو چھپاتے ہوئے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ماں کو یاد کر کے رو رہا تھا۔ جسم تھکن سے چور تھا، صحرا کی ٹھنڈی ریت پر لیٹ کر آسمان کو دیکھا۔ پہلی تاریخ کا چاند کیسر کی مانند تھا۔ چاند کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کب نیند

نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

بچہ نے خواب میں اپنے اردگرد لوگوں کو دیکھا۔ان کے چہرے پاکیزہ اور ہاتھوں میں کھلونے تھے۔ پھر اسے اپنے گرد نورانی چادر محسوس ہوئی جیسے کسی نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔

آنکھ کھلی تو فجر کی روشنی غیر محسوس انداز میں پھیل رہی تھی۔کئی گھنٹوں سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جاگتے ہی بھوک لگی، کھانے کی تلاش میں سفر شروع کیا، انجانی سمت میں چلتا رہا۔تھوڑی دیر بعد مکانات نظر آئے۔ بچہ کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی۔بستی کے قریب پہنچا تو لوگ فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آرہے تھے۔

لڑکا بے مقصد یہاں وہاں گھومتا رہا۔

عیدالفطر کا دن تھا۔صبح سے تمام مسلمان عید کی تیاریوں میں مصروف تھے۔عید کی نماز پڑھنے کے لئے مساجد کا رخ کیا۔سب نے صاف ستھرے لباس پہنے ہوئے تھے۔بازاروں میں میلے کا سماں تھا۔ رمضان کریم کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی خوشی چہروں پر نمایاں تھی۔مدینہ منورہ پر شادمانی ومسرت کی فضا چھائی ہوئی تھی۔لیکن بچہ کا بھوک سے برا حال تھا۔بچہ گھومتا ہوا عیدگاہ تک پہنچا اور ایک طرف کھڑے ہوکر حسرت سے لوگوں کو دیکھتا رہا۔عید کی نماز کا وقت قریب آرہا تھا، بوڑھے اور جوان نئے لباس میں عیدگاہ کی طرف جوق در جوق جارہے تھے۔بڑوں کے ساتھ بچے بھی تھے۔ فضا خوش بو سے معطر تھی۔بچوں کی آوازیں خوش نما، روح پرور، فرحت انگیز اور چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔لڑکے نے حسرت بھری نظروں سے ہم عمر بچوں کو خوب صورت کپڑوں میں دیکھا۔محرومی کا احساس غالب ہوگیا۔بھوک کا خیال ذہن سے نکل گیا اور ماں یاد آگئی۔آنکھیں آنسوؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بن گئیں۔وہ خاموشی سے روتا رہا۔

ہادی برحق حضرت محمدؐ نماز عید کی ادائیگی کے لئے گھر سے باہر تشریف لائے تو راستے مسکرا اٹھے۔ ہر شے سرور وکیف میں ڈوب گئی۔درخت احترام اور محبت سے جھک گئے۔

رحمۃ للعالمینؐ نے دیکھا کہ عیدگاہ کے ایک طرف بچہ کھڑا ہے، پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے اور رو رہا ہے۔نبی کریمؐ قریب تشریف لے گئے، شفقت ومحبت سے لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھا اور دریافت فرمایا، بیٹا! کیوں رو رہے ہو—؟ لڑکے نے بھیگی آنکھوں سے سر پر ہاتھ رکھنے والی ہستی کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ وہ رحمت وشفقت کے سائے میں آگیا ہے۔

اس نے روتے ہوئے کہا، میری ماں نے دوسری شادی کرلی ہے۔اس کے شوہر نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔آج سب لڑکے نئے کپڑے پہن کر خوشی خوشی کھیل رہے ہیں۔ میرے پاس ماں ہے، کھانے کی کوئی چیز ہے اور نہ پہننے کو کپڑے ہیں۔

سرورکونینؐ نے لڑکے کی بات سن کر فرمایا،

اگر میں تمہارا باپ ، عائشہ تمہاری ماں اور فاطمہ تمہاری بہن بن جائے تو کیا تم خوش ہو جاؤ گے؟

لڑکے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا اور آنحضرتؐ سے لپٹ گیا۔آپؐ اسے اپنے ساتھ گھر لائے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے فرمایا: عائشہ! یہ تمہارا بیٹا ہے۔ بچہ نے محبت کے سمندر کو حیرت سے دیکھا۔

آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا، اسے کھانا کھلاؤ اور نہلا کر نئے کپڑے پہناؤ۔

حضرت عائشہؓ نے بچہ کو کھانا کھلایا اور نہلایا۔ بچہ نے نیا لباس پہنا۔ بالوں میں کنگھی کی گئی۔ جب وہ تیار ہو کر آیا تو بچہ کو مسکراتا دیکھ کر آپؐ کو بے حد خوشی ہوئی۔ اسے پیار کیا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔محبت سے اسے دیکھتے ہوئے فرمایا، تم پیدل نہیں میرے کندھوں پر سوار ہو کر عید کی نماز پڑھنے مسجد جاؤ گے۔

آپؐ نے یتیم بچہ کو کندھوں پر سوار کر کے مسجد نبوی کا رخ کیا۔گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ عاشقان رسولؐ نے دیکھا کہ سرور کونینؐ کے کندھوں پر بچہ بیٹھا ہے۔ وہ رسول اللہؐ کی بچوں اور بڑوں کے ساتھ نرمی و شفقت سے واقف تھے۔ لہٰذا خاموشی سے آپؐ کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

مسجد نبوی پہنچ کر حضرت محمدؐ نے بچہ کو اتارا اور منبر پر اپنے ساتھ بٹھایا۔آپؐ نے فرمایا،

''جو شخص یتیم کی کفالت کرے گا اور محبت و شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھے گا ،اللہ تعالی اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں لکھ دیں گے۔''

زندگی دو کرداروں پر مشتمل ہے۔

۱۔ رحمانیت ۲۔ شیطنت

سوتیلے باپ نے بے رحمی کے سبب معصوم بچہ کو ماں سے دور کیا۔فرسودہ روایات کے سبب ماں ستم پر خاموش رہی۔آدمی درندگی پر اتر آئے تو درندے بھی اس سے پناہ مانگتے ہیں۔

اس کے برعکس رحمانی وصف یہ ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا مخلوق سے محبت کرتا ہے اور ہر عمل میں مخلوق کی بھلائی، ان کے دکھ کو بانٹنے اور خوشی میں شریک ہونے کو مقدم رکھتا ہے۔عزیز و اقارب، پڑوسیوں، ضرورت مندوں اور حق داروں کا حق ادا کرنے سے خوشی کی لہریں قلب میں موجزن ہو جاتی ہیں۔

اللہ کے محبوب — خیر البشر — حضرت محمدؐ بچہ کو روتا ہوا نہ دیکھ سکے، قریب گئے ، سر پر دست شفقت رکھا اور آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدل دیا۔

عید — خوشی ہے اور خوشی انسان کو مادی دنیا سے پہلے کی دنیاؤں سے متعارف کراتی ہے۔ جنت کے زون میں نوع آدم کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل تھا۔قرب سے واقف ہونے کا ایک پروگرام رمضان المبارک ہے۔روزہ میں بندہ دنیاوی ذمہ داری پوری کرتا ہے

لیکن دنیا کی ہر شے کو ثانوی حیثیت دے کر ہر کام کیئر آف اللہ کرتا ہے۔ تیس روز اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے سے بندہ ہر کام سے پہلے اللہ کو یاد کرتا ہے۔

جس عمل کی ابتدا اللہ کے نام سے ہو، اس کی انجام دہی کے دوران اللہ کی صفات غالب ہوجاتی ہیں۔ اللہ کے ذکر سے ہر کام شروع کرنے والے بندہ کے دل میں رحم اور ہم دردی پیدا ہوتی ہے اور بندہ عفو و درگزر اور محبت کی تصویر بن جاتا ہے۔ ذکر سے قرب حاصل ہوتا ہے۔ قرب کی تکرار مشاہدہ ہے — مشاہدہ کی خوشی عید ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو اور ناشکری مت کرو۔'' (البقرۃ: ۱۵۲)

رب کی دید — مومن کی عید ہے۔

عید کے بارے میں شیخ ابن عربیؒ نے لکھا ہے،

صلوٰۃ العید تکرار الشہود
بما یبدو علیٰ من الوجود
اذا جلیٰ لنا ما کان منہ
لنا منی بہ فی کل عید
فعیدی من وجودی یوم جود
یمن بہ علیٰ بلا مزید
اکبرہ بسبع ثم خمس
عن القرب المقید بالورید
واطلب منہ ما تعتیہ ذاتی
لذاک الیوم من لبس جدید

ترجمہ: وہ شہود جو وجودِ حق سے مجھ پر ظاہر ہوتا ہے، اس شہود کی تکرار — اللہ سے ربط کی خوشی ہے۔ وجود میں سے جو کچھ ہمارے لئے ہے جب وہ جلوہ گر ہوتا ہے تو عید میں ہم اس نعمت کے سبب سے شکر گزار ہوتے ہیں۔ یہ مشاہدہ کہ ہمارا وجود اللہ تعالیٰ کی صفات کے سبب ہے، عید کے سرور کا سرچشمہ ہے۔ وہ قرب جو رگ جاں سے منسلک ہے اس کی روشنی میں سات اور پھر پانچ تکبیریں پڑھ کر مجھے ادراک ہوا ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کا بیان ممکن نہیں — اللہ ہر تعریف سے ماورا ہے (تکبیروں سے سات آسمانوں، عرش، حجاب کبریا، حجاب عظمت، حجاب محمود اور مقام محمود کی طرف اشارہ ہے)۔ عید کے دن نئے لباس کا اہتمام ہوتا ہے۔ وجود باری تعالیٰ لامحدود ہے، میں اس امر کا طالب ہوں کہ وہ میری بندگی کو اپنی کبریائی میں چھپالے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور پاکؐ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ رحمۃ للعالمین حضور پاکؐ کی سنت اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری ہے۔ اللہ نے مخلوق کے احترام، ان سے رحم دلی اور بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک کی خدمت کا حکم دیا ہے۔ زندگی جب احکامات الٰہی کے تابع گزاری جائے تو ہر روز روزِ عید اور ہر شب، شبِ برات ہوتی ہے۔

آپ سب کو عید مبارک!

مسائل کا حل

زندگی تین رخوں پر چل رہی ہے۔ اسپیس کی حد بندی میں رہتے ہوئے اسپیس سے گزرنا۔ اس میں مخلوق پابند ہے اور آزاد بھی۔ مثلاً آدمی دو پیروں اور دو ہاتھوں سے چلتا ہے۔ دو پیروں اور دو ہاتھوں سے چلنے سے مراد چار پہیے ہیں اور یہ حرکات وسکنات کے لئے ضروری ہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ چار میں سے دو پہیے استعمال کریں۔ زمین پر چلنے کے لئے اسپیس آدمی کے تابع ہے اور آدمی بھی اسپیس کے تابع ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اسپیس پہ رہنا مجبوری ہے۔ لیکن — اسپیس پہ ایک باڈی بے حس وحرکت اور ایک باڈی وہ سب کام کر رہی ہے جو اسپیس سے دور ہے مگر زمینی اسپیس سے پچاس میل دور ہو کر بھی وہ چلتی، پھرتی اور ہر وہ کام کرتی ہے جو اسپیس میں رہ کر کیا جاتا ہے۔ چلنا، پھرنا اور رکنا اس وقت ممکن ہے جب اسپیس ہو۔ جو کام ہم بیداری میں کرتے ہیں وہی کام ایسی حالت میں کرتے ہیں جو بیداری سے متضاد ہے۔ اس حالت میں بیداری میں چلنے والی تصویر (میٹریل باڈی) بے حس وحرکت ہے۔ مگر ایک اور وجود ہر وہ کام کر رہا ہے جو بیداری میں جسم کرتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ اگر پلاؤ کھائے جب کہ وہ زمینی شعور میں نہیں ہے، تو زمینی شعور میں آنے کے بعد اس کی شکل وصورت ذہن میں رہتی ہے اور آدمی ذائقہ اور خوش بو کو محسوس کرتا ہے۔ مشاہدہ ہے کہ آدمی خواب میں حلوہ کھاتا ہے، بیدار ہونے کے بعد دوسرے آدمی کو جو سویا نہیں، ہاتھ سامنے کرتا ہے تو ہاتھ میں سے حلوہ کی خوش بو آتی ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ نے اس کی ایک مثال غسل واجب ہونا فرمائی ہے۔ عام تجربہ ہے کہ سوتے ہوئے جب کہ فزیکل باڈی بے حس وحرکت ایک طرف پڑی ہے، سانپ کاٹتا ہے۔ وہ باڈی جو میٹریل باڈی نہ ہونے کے باوجود حرکت کر رہی ہے، خوف زدہ ہو کر نیند سے بیدار ہو جاتی ہے اور تکلیف کا اظہار بھی کرتی ہے — خواب میں یہ عمل پیراسائیکالوجی کا ایک باب ہے۔

خیال وہ تحریک ہے جس سے فرد کو اپنی اور دیگر افراد کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے بصورت دیگر اس کی حیثیت پتلے کی ہے جسے اللہ کے فرمان ''الست بربکم'' سے پہلے اپنے ہونے اور نہ ہونے کا احساس نہیں تھا۔

زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہر مرحلہ خیال کے تابع ہے جب کہ خیال پر آدمی کا اختیار نہیں۔ خیال کہاں سے آتا ہے؟ جواب کے لئے ماضی سے رجوع کرنا ہوگا۔

جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا۔ اللہ نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں لہٰذا پہچان کے لئے ارادہ میں موجود پروگرام کو محبت کے ساتھ ظاہر فرما دیا۔ مظاہرہ کی ابتدا ارادہ سے

ہوئی اور یہ ارادہ کائنات کے لئے خیال کی ابتدا ہے۔

اللہ نے قرآن کریم میں خود کو احسن الخالقین — تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق فرمایا ہے۔ تخلیق کی صلاحیت مخلوق کو عطا کی گئی ہے مگر اختیار اللہ کے پاس ہے۔ آدمی تخلیق شدہ شے میں تصرف کر کے ایجاد یا اختراع کر سکتا ہے، اس کے اجزا کو بنا نہیں سکتا — وہ پہلے سے موجود شے کو استعمال میں لاتا ہے۔

مثلاً دھات — سائنس و ٹیکنالوجی میں کوئی شے ایسی نہیں جس میں دھات استعمال نہ ہوتی ہو۔ موجد جہاز بناتا ہے لیکن لوہے کے ذرّات تخلیق نہیں کر سکتا۔ پانی سے بجلی بناتا ہے لیکن پانی نہیں بنا سکتا۔ اور پانی سے بجلی بھی اس لئے بناتا ہے کہ بجلی پانی میں موجود ہے۔

پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور زیر زمین ذخیرہ ہو کر سمندر بن جاتا ہے۔ مخلوق سمندر میں تصرف کرتی ہے لیکن سمندر بنا نہیں سکتی۔ اسی طرح آدمی زمین کو رہنے کے لئے ہموار کرتا ہے مگر زمین تخلیق نہیں کر سکتا۔ زمین، سمندر، دھاتیں — پہلے سے موجود ہیں۔

مظاہر کائنات میں تصرف کا سبب خیال ہے۔ خیال نہ آئے تو میز پر رکھا قلم نظر نہیں آتا۔ پانی سامنے ہو کر پیاس نہیں لگتی۔ بھوک کی طرف ذہن نہیں جاتا، ہکان کے باوجود نیند نہیں آتی، لکھنے کی خواہش رکھتے ہوئے فرد جملہ نہیں لکھ سکتا، اچھا مقرر نہیں بن سکتا، پلک نہیں جھپکا سکتا، سانس نہیں لے سکتا، آواز نہیں سن سکتا، بات سمجھ نہیں سکتا۔ یہ سب کیا ہے —؟

ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ فرد خیال کے تابع ہے اور اس کی حیثیت مشین کی ہے۔ اطلاع ذہن پر وارد ہوگی تو کام ہوگا۔ اطلاع کے وارد ہونے یا اس پر عمل کرنے کو فرد اپنا اختیار سمجھتا ہے اور یہاں سے مسائل شروع ہوتے ہیں۔

آدمی بیک وقت دو عالمین میں زندگی گزارتا ہے۔ خواب میں اس کی حیثیت معمول کی ہے جب کہ بیداری میں بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں لیکن توجہ نہ ہونے کی وجہ سے حقیقت کا ادراک نہیں ہے۔ تقاضے دونوں میں یکساں ہونے کے باوجود ایک میں زندگی روانی سے گزرتی ہے جب کہ دوسری میں خوف اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ خواب کی دنیا میں روانی ہے یعنی خیال کے ساتھ عمل ہونا تو نیند میں ہم ڈرکیوں جاتے ہیں یا ڈراؤنا خواب دیکھنا کیا ہے —؟

جواب یہ ہے کہ نیند کی دنیا بیداری کا نقش ہے، ایسا نقش جو دن بھر ذہن میں گردش کرنے کے بعد نیند کی دنیا میں منعکس ہوتا ہے۔ آدمی اعمال کے مطابق خواب دیکھتا ہے۔ خواب پراگندہ ہو تو مطلب یہ ہے کہ ذہن دن میں ایسی بات پر مرکوز ہو گیا کہ نیند میں آزاد دنیا محسوس کرنے کے بجائے دن والی کیفیت غالب رہی۔

دل مغموم ہو تو موسم اچھا ہونے کے باوجود فرد پر پژمردگی چھائی رہتی ہے۔ دل خوش ہو تو سخت گرمی میں

بھی فرد شاد ہوتا ہے۔ موسم کا اچھا ہونا یا گرمی — ماحول ہے۔ ماحول میں داخل ہونے کے باوجود فرد اپنے اندر کی کیفیت میں گم رہا اور اسی کے مطابق ماحول کو دیکھا۔

لاشعوری دنیا میں ہر طرف خیر ہی خیر ہے۔ لاشعور سے آنے والی اطلاع ایک ہے۔ انفرادیت کے احساس کی وجہ سے ہر فرد الگ معنی پہناتا ہے۔ کمرے میں پانچ افراد بیٹھے ہیں، کھانا کھانے کا خیال آتا ہے لیکن کھانا بنانے کے لئے دیکھتے سب ایک فرد کی طرف ہیں جب کہ جس فرد کی طرف دیکھا گیا ہے، وہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کا ہاتھ بٹائیں۔ بھوک کے تقاضے کی اطلاع ملی لیکن لاشعور نے یہ نہیں کہا کہ کھانا کوئی اور بنائے گا۔ معنی پہنانے سے ذہن کا عمل دخل شروع ہوتا ہے جب کہ ذہن کا عمل دخل نہیں ہے!

معنی پہنا کر فرد کائناتی پروگرام کو تبدیل نہیں کر سکتا البتہ خود کو نقصان ضرور پہنچاتا ہے۔ جب تک شعور بیدار نہ ہو، نیند کی دنیا میں داخل ہونے کے باوجود فرد لاشعوری تحریکات سے ناواقف رہتا ہے — وہ وہاں بھی اپنے ذہن کے دیکھنے کو دیکھتا ہے۔ یہی خوف کا سبب ہے۔ ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

اچھی ہے بری ہے دہر فریاد نہ کر
جو کچھ کہ گزر گیا ہے اسے یاد نہ کر
دو چار نفس عمر ملی ہے تجھ کو
دو چار نفس عمر کو برباد نہ کر

''دنیا کی ہر چیز ایک ڈگر پر چل رہی ہے۔ ایک بات جو کسی کے لئے خوشی کا باعث ہے، وہی دوسرے کے لئے پریشانی اور اضمحلال کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ دنیا معنی اور مفہوم کی دنیا ہے۔ جو جیسے معنی پہنا دیتا ہے اس کے اوپر ویسے اثرات مرتب ہو جاتے ہیں۔ پھر کیوں دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر وقت کو برباد کیا جائے۔ یہ جو دو چار نفس کی زندگی ہے اسے ضائع نہ کر۔ ہر بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ۔ پروردگار عالم فرماتے ہیں — اور وہ لوگ جو راسخ فی العلم ہیں، کہتے ہیں کہ ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے۔''

(کتاب: تذکرہ قلندر بابا اولیاؒ)

مزاج کے بننے میں ماحول کا کردار اہم ہے، اسی کے زیر اثر فرد اطلاع کو قبول یا رد کرتا ہے۔

۱۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے نے ماحول کے اثر کو قبول کیا اور والد کی طرز فکر سے روگردانی کی۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے بت پرست ماحول کی طرز فکر کو رد کر کے ضمیر کی آواز کو نصب العین بنایا جس سے ماحول ان کو متاثر نہ کر سکا۔

یہ ذہنی تحریک کی مثالیں ہیں۔ ایک فرد نے لاشعور کی آواز کو رد کیا۔ دوسری ہستی قبول کر کے حق الیقین میں داخل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم الاسما سے نواز کر ذہن کو لامحدود وسعت عطا کی ہے۔ علم الاسما — اللہ تعالیٰ کے صفاتی علوم ہیں جن پر کائنات کا نظام قائم ہے۔ ہر صفت ''تخلیق'' ہے اور نظام زندگی پر محیط ہے۔ محبت کا سورس — اللہ کی صفت ود و د ہے۔

خبر کا سورس ـــ اللہ کی صفت خبیر ہے۔

سماعت کا سورس ـــ اللہ کی صفت سمیع ہے۔

بصارت کا سورس ـــ اللہ کی صفت بصیر ہے۔

کلام کا سورس ـــ اللہ کی صفت کلیم ہے۔

فہم کا سورس ـــ اللہ کی صفت باطن ہے۔

آدمی اللہ کی عطا کی گئی سماعت و بصارت و ادراک سے سنتا اور دیکھتا ہے۔ جب ان نعمتوں کو وہ قدرت کے ناپسندیدہ کاموں میں استعمال کرتا ہے تو یہاں سے پابند اور پریشان زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔

ایک شخص نے خط میں لکھا ـــ میں بچپن سے حد سے زیادہ سوچنے کا عادی ہوں۔ بات چھوٹی ہو یا بڑی، ایک دفعہ ذہن میں آجائے تو پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ سوچتا رہتا ہوں اور سوچتے سوچتے گہرائی میں ڈوب جاتا ہوں۔ معمولی مسئلہ بہت بڑی الجھن بن جاتا ہے۔ الجھن سے الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور یکے بعد دیگرے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میں ذہنی الجھنوں کا مریض بن گیا ہوں۔

علم مابعد النفسیات کے تحت مسئلہ کا حل یہ بتایا گیا، تخلیقی قانون کے تحت انسانی ذہن تین پرت کا مجموعہ ہے۔ ہر پرت کے محسوسات ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان تینوں میں ایک پرت وہ ہے جو خیال کو تصور بنا کر جسد خاکی میں منتقل کرتا ہے۔ جسد خاکی تصورات کو معنی کا لباس پہنا کر خوشی اور غم کے نقش و نگار ترتیب دیتا ہے۔ اس کو اگر ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو خوشی کا پیش خیمہ ہوں تو اس کے اندر خوشی میں طوفان آجاتا ہے۔ اگر ایسی اطلاعات فراہم کی جائیں جن کا تعلق رنج و غم سے ہو تو اس کے اندر مایوسی، بے کیفی، احساس کم تری، زندگی سے بیزاری، اور نت نئی الجھنیں جنم لیتی ہیں۔ یہ پرت بالکل غیر جانب دار ہوتا ہے۔ اس کو جیسی اطلاعات فراہم کردی جاتی ہیں وہ ان کو مظاہر میں پیش کردیتا ہے۔ اطلاع فراہم کرنے والا پرت جب فطرت سے کٹ جاتا ہے یا اس میں فطرت کے اصولوں سے دوری واقع ہوجاتی ہے تو وہ ایسی اطلاعات دینا شروع کردیتا ہے جو فطرت کے خلاف اور غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ فطرت میں مایوسی، احساس شکستگی، خودکشی کا رجحان، خود کو دیگر لوگوں سے کم تر یا برتر سمجھنا، الجھنوں میں گرفتار رہنا کہیں نہیں ہے۔ یہ سب غیر فطری چیزیں ہیں۔ فطرت ہمیشہ پُرسکون رہتی ہے۔ فطرت سے دوری ہی انسانی مصائب و مشکلات کا سبب بنتی ہے۔ فطرت سے قریب آجائیں، سارے مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔ طریقہ یہ ہے کہ صبح منہ اندھیرے اٹھیں اور جھٹ پٹے (سیاہی اور اجالے کا سنگم جو فجر اور مغرب کے وقت ہوتا ہے) میں کم سے کم دو میل روزانہ ٹہلیں۔ زیادہ سے زیادہ تین ہفتے میں آپ الجھنوں سے نجات حاصل کرلیں گے۔ لیکن فطرت سے قریب ہونے کا یہ طریقہ کم سے کم تین ماہ جاری رکھیں۔''

(جاری ہے)

صبر دہلوی

حسن کیا ہے ــــ؟

عیب شناس یا عیب بین کی نگاہوں میں حسن اور کیفیتِ حسن نہیں جچتا۔اس کے برعکس حقیقت آشنا اورحسن پرست ہر رنگ،آن اورشان میں خوب صورتی دیکھتے ہیں۔

پانی میں بھی ٹھنڈ ہے اور برف بھی سرد ہے۔کاسنی میں بھی ٹھنڈک ہے اور مہندی بھی سرد ہے ۔اگرچہ نسبتِ برودت (ٹھنڈ) کے اعتبار سے متذکرہ اشیا میں وحدت پائی جاتی ہے لیکن کیفیتِ برودت کے اعتبار سے ان میں امتیاز ہے۔ پانی میں ٹھنڈ کی کیفیت مختلف ہے، برف کی ٹھنڈ کچھ اور ہے۔ برودتِ حنا میں اور بات ہے تو کاسنی کی سردی الگ ہے۔اگر کوئی شخص صرف حنا کی ٹھنڈک پر سردی کو ختم سمجھے تو وہ دیگر اشیا میں پائی جانے والی ٹھنڈ سے نا آشنا رہے گا۔ وہ کسی حالت میں ان کیفیات سے واقف نہیں ہوسکتا جو دیگر اجسام یا ٹھنڈی تاثیر (اشیائے باردہ) رکھنے والی اشیا میں موجود ہیں۔

اسی طرح وہ شخص جو صرف آگ کی حرارت سے واقف ہے وہ دیگر اجسام یا اشیائے حارہ (گرم تاثیر رکھنے والی اشیا) کی حرارت سے کیوں کر واقف ہوسکتا ہے یا اسے کیسے یقین ہوگا کہ حرکت یا رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔

خود کو محدود رکھنا نقص ہے جس سے حقائق منکشف نہیں ہوتے اور ذہنی نشوونما کا عمل رک جاتا ہے۔جب ہم محدود عمل سے حاصل ہونے والی معلومات پر تکیہ کرتے ہیں تو گردوپیش کا معائنہ اور مشاہدہ نہیں کرسکتے۔معلوم ہوا کہ ہم محدود حالت میں رہتے ہیں جس کی وجہ سے مفید باتیں احاطۂ عمل سے دور ہوجاتی ہیں اور ہم کنوئیں کے مینڈک کی طرح ہوجاتے ہیں جو ساری دنیا کو کنوئیں کے دائرہ کے برابر سمجھتا ہے۔محدود خیالی علمی ترقی میں بنیادی رکاوٹ ہے جس سے فہم کا دائرہ دن بدن تنگ اور تاریک ہوجاتا ہے۔ تنگ خیال گروہ ترقی نہیں کرتا۔

اے در طلب کمال سرگرم شتاب
درصورت کس مبیں و معنی در یاب

ترجمہ: اے وہ شخص جو کمال کی طلب میں سرگرم ہے، کسی ظاہری شکل و ہیئت کو نہ دیکھ، معانی کی جستجو کر۔

ٹھنڈک اور حدت کی طرح خوب صورتی اور بدصورتی کے بارے میں ہمارے خیالات اور معلومات محدود

ہیں۔اس بارے میں لوگوں کی معلومات ابتدائی مراحل میں ہیں۔اکثر لوگوں نے خوب صورتی اور بدصورتی کو نقوش اور خوش نما رنگ یا سڈول جسم پر منحصر کیا ہے حالاں کہ حسن یا خوب صورتی اس قدر محدود نہیں۔ محدود خیالی کی وجہ خوب صورتی کے مفہوم سے نا آشنا ہونا ہے۔ہم نام کی حد تک ان کے بارے میں جانتے ہیں اور علمی لحاظ سے غور نہیں کرتے۔

حسن کیا ہے —؟ یہ ایک کیفیت ہے جو ہمارے اندر کسی کے لئے پیدا ہوتی ہے۔حسن یا خوب صورتی کو سمجھنے کے لئے یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ شے، وجود اور کیفیت میں فرق ہے۔ جیسے گل، گلاب اور کیفیتِ گلاب— گل یا پھول کے تین رخ ہیں۔گل و گلاب میں ایک ایسی کیفیت یا دل چسپی پائی جاتی ہے جو گلاب سے خارج ہو کر فضا میں بکھرتی ہے۔گلاب اپنی طرف نہیں کھینچتا، اس کی کیفیت اپنی طرف کھینچتی ہے جو اس کے رنگ و بو میں پائی جاتی ہے۔کیفیت ختم ہو تو گل اور گلاب میں کشش ہوتی ہے نہ مہک اور خوب صورتی کا احساس ہوتا ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ ''فلاں چیز میں وہ آب ہی نہیں رہی'' تو مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس شے سے کیفیت و نفاست رخصت ہو گئی۔

خوب صورتی ایسی کیفیت ہے کہ جو ذہنی یا وجدانی طور پر محسوس ہوتی ہے۔ دنیا میں جس قدر اشیا، وجود اور ہستیاں پائی جاتی ہیں ان میں کوئی بھی کیفیت سے خالی نہیں۔ جو اشیا ہماری نظر سے دور ہو جاتی ہیں ان کا احساس ذہن اور حافظہ کرتا ہے اور اس وقت ہم یہ کہنے کے مجاز ہوتے ہیں کہ فلاں شے ہمارے ذہن میں ہے۔ یہ لاشعوری کیفیت کے تحت ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو ہم ان کے اظہار سے قاصر ہیں۔

جب ہم خوشی محسوس کرتے ہیں تو اس وقت کیا کوئی شے نظر کے سامنے ہوتی ہے —؟ حالاں کہ خوشی سے دل و دماغ میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہم اس شے کو یقین کے درجہ میں محسوس کرتے ہیں۔اپنی کیفیت پر ہم خوب صورتی اور بدصورتی کے اطلاق کے عادی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ کیسا عمدہ شعر ہے، کتنا اچھا فقرہ ہے، کیا خوب استدلال ہے۔ بدصورتی کے بیان کے لئے بھی اسی طرح کے جملے استعمال ہوتے ہیں۔کیا یہ جملے نظر آتے ہیں؟ بلکہ الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ان کی تصویر ذہن میں بنتی ہے، جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو ہم خوب صورت یا بدصورت کہتے ہیں۔ اگر ہم ان جملوں سے متفق نہ ہوں تو شے کی خوب صورتی کے باوجود ہماری رائے مختلف ہوگی۔ چیزوں کے استعمال کی وجہ سے ذہن میں خاص کیفیت منتقل ہوتی ہے جس پر دانائی، عقل یا فراست کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

حسن کی وسعت کہاں تک ہے —؟

حسن کی ایک سے زائد تعریفوں کی وجہ ذوق، مزاج،

مفاد، رواج اور عادت ہے۔ تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے،

۱۔ حسن ایسی چیز ہے جو خوبی کے اعتبار سے دیکھنے والے کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۲۔ تناسب زیبائی اور رعنائی کے سبب کشش رکھتا ہو۔

۳۔ نقائص سے پہلے خوبیوں کا اعلان کرتا ہو۔

۴۔ جس کی تائید میں رائے عامہ متفق ہو۔

۵۔ خوب صورتی ذوق کا انتخاب ہے۔

حضرت امیر خسرو دہلویؒ فرماتے ہیں،

آفاقہا گردیدہ ام، مہرتباں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری

ترجمہ: میں سارا جہان گھوما ہوں اور حسینوں کی محبت میں گرفتار ہوا ہوں، بہت خوب صورت لوگوں کو دیکھا ہے لیکن تم سب سے الگ ہو۔

ذوق وہ طاقت یا عادت ہے جو اپنا پہلو غالب رکھتی ہے۔ چوں کہ سب کا ذوق مختلف ہے اسی لئے حسن کے معیار میں اختلاف لازمی ہے۔ بہت سی اشیا ایسی ہیں جنہیں لوگ ایک پیمانہ پر خوب صورت تسلیم کرتے ہیں مگر اس چاہنے میں بھی کوئی نہ کوئی فرق رہ جاتا ہے۔ بہت سے لوگ گلاب کے پھول اور مہک کو دیکھنے اور سونگھنے کی حد تک پسند کرتے ہیں یا عطر گلاب کی نفاست ولطافت اور خوبی کے دلدادہ ہوتے ہیں لیکن استعمال ان کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ پہلے وقتوں میں اکثر لوگ گیس کی روشنی کو پسند کرتے تھے اور بہت سے لوگ کڑوے تیل کی روشنی کو اچھا جانتے تھے۔ آخر الذکر اشخاص کا خیال ہے کہ گیس کی روشنی اگرچہ تیز اور شفاف ہے لیکن آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

مفاد، استعمال اور عادت کے اعتبار سے حسن کی تعریف ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ ایک شخص اس شے کو خوب صورت سمجھتا ہے جو اسے پسند ہو ــــ یہ عادت ہے، استعمال ہے اور مفاد بھی۔

کسی دانش ور کا کہنا ہے کہ اشیا کے انتخاب میں عادت کا گہرا دخل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم ایک ایسی جماعت میں شامل ہوں جس میں لوگ ہمیں بدصورت معلوم ہو سکتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ انسیت پیدا ہوگی اور ہمیں ان میں خوب صورتی نظر آئے گی۔ بتانا مشکل ہے کہ تنقید کے بعد ہم نے اس کے اندر کس شے کو حسن کہا یا خوب صورت قرار دینے کے بعد کس بنیاد پر تنقید کی۔ اس رائے پر کوئی کلیہ قائم کرنا ممکن نہیں۔

بعض کے خیال میں خوب صورتی اپنے دائرہ میں محدود ہے۔ دائرہ اس کی وسعت ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ خوب صورتی اور بدصورتی ہر شے میں پائی جاتی ہے۔ ایک جہت سے اگر شے خوب صورت ہے تو دوسری جہت سے وہی شے بدصورت لگ سکتی ہے۔ بعض چیزیں دیکھنے میں اچھی اور استعمال میں بری ثابت ہوتی ہیں۔ بعض کی رائے میں دونوں کا انحصار نظر اور ذوق پر ہے۔

کسی صوفی منش حکیم کا کہنا ہے کہ دنیا کے ہر منظر میں خوب صورتی ہے، دیکھنے والی آنکھ چاہئے۔ حقیقت بین نظر سے دیکھا جائے تو کوئی خلقت ایسی نہیں جس میں قدرت کے عجائبات کا جلوہ نہ ہو۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

ترجمہ: سبز درختوں کے پتوں کو غور سے دیکھو، ہر پتا پروردگار کی معرفت کا ایک دفتر (بڑا رجسٹر) ہے۔

شیخ سعدی نے ''برگ درختان سبز'' کے فقرہ سے شعر کے معنی کو محدود کر دیا ہے۔ اس فقرے میں جس چیز کو متصف کیا جائے موزوں ہوتا جائے گا۔ ایسی کوئی چیز نہیں جس میں حسن کی جھلک نہ ہو۔ مناظر قدرت ہمیشہ خوش نما نظر نہ آئیں تو یہ ہمارے ذوق کا قصور ہے۔

دنیا میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

۱۔ اشیا اور مناظر میں نقص دیکھنے کے عادی۔

۲۔ جن کی نگاہ ہمیشہ حسن دیکھتی ہے۔

عیب شناس یا عیب بین کی نگاہوں میں حسن اور کیفیتِ حسن نہیں جچتا۔ اس کے برعکس حقیقت آشنا اور حسن پرست ہر رنگ، آن اور شان میں خوب صورتی دیکھتے ہیں۔

بہر سو جلوۂ دلدار دیدم
بہر چیزے جمال یار دیدم
ندیدم ہیچ شے را خالی ازوے
پر از وے کوچہ و بازار دیدم

ترجمہ: ہر طرف دل دار کا جلوہ دیکھتا ہوں۔ ہر شے میں مرے محبوب کا حسن ہے۔ کوئی شے اس سے خالی نہیں، گلی کوچے بھی اس کے حسن کا عکس ہیں۔

جس تناسب سے فرد کسی چیز کا ذوق رکھتا ہے، یہی تناسب خوب صورتی اور بدصورتی کا معیار بن جاتا ہے۔ شے یا منظر کو دیکھنے سے دل میں پسندیدگی کی لہریں اٹھتی ہیں اور یہ لہریں تاثیرِ حسن کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔

ناپسندیدہ کیفیت میں بھی یہی عمل کام کرتا ہے۔

اچھی کتاب پڑھنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اظہار کے لئے اکثر اوقات مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ بعض اوقات کسی شعر کے پڑھنے سے بے خود کرنے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ فرد بیان سے عاجز ہوتا ہے۔ دل ان کیفیات کو محسوس کرتا ہے، اسے بیان کرنا چاہتا ہے لیکن بیان کرنے سے احساس کی خوب صورتی محدود ہو جاتی ہے۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

مختصر یہ ہے کہ حسن احساس ہے۔ خوب صورتی اور بدصورتی کا تعلق شے سے نہیں، مزاج اور پسند و ناپسند سے ہے، یہی وجہ ہے کہ دانش ور ایک تعریف پر متفق نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شے کو خوب صورت یا بدصورت قرار دے کر دراصل ہم اپنے مزاج اور اپنی پسند و ناپسند کو اچھے اور برے کا نام دیتے ہیں۔

محمد عدنان خان

ٹرانس ہیومن ازم کیا ہے ــــ؟

آدمی اور انسان کے فرق سے واقف ہو کر فرد حیوانیت کے دائرہ سے نکل جاتا ہے۔

تمام الہامی کتب میں ''انسان اور آدمی'' کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر تخلیق کیا پھر اسے اسفل سافلین میں پھینک دیا'' (التین: ۴۔۵)

حقیقت پسند لوگ انسان کو تلاش کرنے کے لئے اپنے اندر دیکھتے ہیں جب کہ مادیت پسند، انسان اور آدمی کے فرق کو باہر تلاش کرتے ہیں۔ آدمی کو انسان بنانے کی محققین کی کوشش کا احوال پڑھئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جہاں زمین نے بڑے بڑے سورماؤں، نڈر سپہ سالاروں، عالم فاضل یا پھر جہالت میں مبتلا لوگوں، ذہین وفطین یا پھر جابر حکم رانوں کے ساتھ طویل القامت اور طویل العمر لوگوں کا بوجھ سہا ہے وہیں پیغمبران کرام اور اولیاء اللہ جیسی مقدس ہستیوں نے بھی دھرتی کو عزت بخشی ہے۔

تاریخ میں سپر ہیروز کا تذکرہ موجود ہے۔ نوع آدم میں جو افراد پیدا ہوتے ہیں، ان ہی میں سے کچھ سپر ہیرو بنتے ہیں اور بعض سپر ہیرو کا الٹ ہو جاتے ہیں۔ گویا ہر فرد میں سپر ہیرو کے ساتھ سپر زیرو بھی چپکا ہوا ہے۔ بات اس سپر ہیرو کو تلاش کرنے کی ہے۔ تلاش کا دارومدار تربیت اور درست سمت میں کوشش پر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری شامل حال نہ ہو تو کوشش کا نتیجہ فساد و تباہی ہے۔

نوع آدم ابھی کلوننگ کی خام خیالی سے پوری طرح باہر نہیں آئی تھی کہ اس کے سامنے ''ٹرانس ہیومن ازم'' کا دھماکا کر دیا گیا۔ سائنسی ترقی کا بے لگام گھوڑا بار بار ان چراگاہوں میں داخل ہونے کی کوشش میں ہے جہاں فقط خاردار جھاڑیاں زخمی کرنے کے لئے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو نظام قائم کیا ہے اس میں مداخلت کے نتائج ہمیشہ تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

بات آگے بڑھانے اور یہ سمجھنے سے پہلے کہ ''ٹرانس ہیومن ازم'' کیا ہے، ہمیں genes کو سمجھنا ہوگا۔

جسم خلیات کا مرکب ہے۔ ہر خلیہ میں مرکزہ یا نیوکلس ہوتا ہے۔ نیوکلس میں دیگر اجزا کے ساتھ کروموسومز کے 23 جوڑے ہوتے ہیں۔ کروموسومز کی تعداد ہر جان دار میں مختلف ہے۔ مثلاً مکھی میں کروموسومز کے چھ جوڑے، کتے میں 39 اور بَن مانس میں کروموسومز

کے 24 جوڑے ہوتے ہیں ۔ ہر جانور میں ان کی تعداد مخصوص ہے۔

محققین کے بقول کروموسوم 60 فی صد پروٹین اور 40 فی صد DNA پر مشتمل ہوتا ہے۔ انسانی کروموسوم کے DNA میں تقریباً تین سو سے گیارہ سو تک جینز ہوتے ہیں۔ جین — جینیٹک کوڈز کا مجموعہ ہے۔ کسی فرد کی تمام خصوصیات، ظاہری صورت، رنگ، قد، آنکھوں کا رنگ، ذہانت اور کم زوریاں سب جین میں نقش ہیں۔ ہر جین اپنے اندر خواص کو کوڈز کی صورت میں محفوظ رکھتا ہے۔ فرد کی خصوصیات و صلاحیتیں مختلف جینز میں تقسیم ہو کر کوڈز کی صورت میں محفوظ ہوتی ہیں۔

محققین نے ان کوڈز کو نیوکلیوٹائیڈ اور امائنو ایسڈز کی بنیاد پر G,C,A اور U کا نام دیا ہے۔ کسی فرد یا جانور کی کوئی بھی خصوصیت انہی کوڈز کو ملا کر لکھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جین خواہ کسی جانور کا ہو، پرندہ کا یا کسی درخت کا، جین میں تحریر کوڈز کی زبان پڑھنے، لکھنے اور سمجھنے کا طریقہ کم و بیش ایک ہے۔

ٹرانس ہیومن ازم کو سمجھنے کے لئے ''ٹرانس جینک'' کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ دو مختلف نوعوں کے درمیان جین کا تبادلہ جو کسی سائنسی لیب میں انجام دیا جائے ''ٹرانس جینک'' کہلاتا ہے۔ دونوں نوعوں میں باہمی ربط یا تعلق ہونا ضروری نہیں۔

بڑی مثال ''اسپائڈر گوٹ'' نامی بکری کی ہے۔ اس ٹرانس جینک بکری کو ڈیزائن کرنے کا مقصد مکڑی کے ریشم کا حصول تھا۔ مکڑی جالا بنانے کے لئے ریشم اپنی لحمیات (proteins) سے بناتی ہے۔

ترقی یافتہ دنیا کے کئی بڑے ادارے جن میں دفاع اور دواسازی کی صنعتیں شامل ہیں، ٹرانس جینک ریسرچ میں پیش پیش ہیں اور بڑے پیمانہ پر وسائل خرچ ہو رہے ہیں۔ امریکی ملٹری کا ادارہ DARPA (ڈیفنس ایڈوانس ریسرچ پراجیکٹس ایجنسی) اس سلسلہ میں کئی منصوبوں پر کام کر چکا ہے۔ اسپائیڈر گوٹ ''ڈارپا'' کا منصوبہ تھا۔ محقق کے بقول بکری کے ڈی این اے میں مکڑی کا ڈی این اے شامل کرنے پر بکری کی جو قسم حاصل ہوئی اس کے دودھ میں ایک اضافی پروٹین ہوتا ہے جس کے ذریعہ مکڑی کا ریشم تیار کیا جا رہا ہے۔ اس ریشم کے ذریعہ امریکی فوج ہلکے اور مضبوط بلٹ پروف جیکٹوں کے ساتھ بیگ، رسیاں، جال اور پیراشوٹ تیار کر رہی ہے۔ ان کی مضبوطی اور ہلکا پن کسی اور ریشم سے ممکن نہیں۔

ٹرانس جینک پر تحقیق میں دواسازی کی صنعت بہت آگے ہے۔ بظاہر ان کا مقصد بیماریوں کے نئے علاج دریافت کرنا اور صحت کے شعبہ میں بہتری ہے لیکن درحقیقت ان کی دل چسپی ''نیوڈرگ تھراپی'' سے وابستہ ہے۔ یہ صنعت گہری دل چسپی رکھتی ہے کہ ادویات پر تجربات کے لئے ایسے ٹرانس جینک جانور ڈیزائن کئے جائیں جن کے ڈی این اے میں انسانی ڈی این اے کی

ملاوٹ ہو اور انہیں نئی ادویات پر تجربات کے لئے بآسانی استعمال کیا جاسکے۔

ٹرانس ہیومن ازم کیا ہے —؟ عالم گیر تحریک ہے جس کا بنیادی مقصد ٹرانس ہیومنز کی پیدائش ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہم اس قابل ہوچکے ہیں کہ ڈی این اے کی زبان کو سمجھ سکتے ہیں اور مرضی کے مطابق اس میں تبدیلی بھی کرسکتے ہیں اس لئے ہمیں اپنی جینیاتی بناوٹ تبدیل کرکے زیادہ بہتر اور ارتقایافتہ انسان میں بدل جانا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں محققین کا کہنا ہے کہ اب ہمیں * Homosapien کی ماہیت میں اپنے آپ کو بدل لینا چاہئے۔ (جینیاتی ساخت کو بدلنے کی خواہش اور نظریہ رکھنے والے محققین کا تعلق اس گروہ سے ہے جو سمجھتے ہیں کہ موجودہ آدمی بن َمانس کی بدلی ہوئی شکل ہے۔) ٹرانس ہیومن ازم کی تحریک H+ کے نام سے بھی جانی جاتی ہے یعنی ہیومن پلس — ایسے بشر جو پوسٹ ہیومن کہلانے کے لائق ہوں گے اور ان کے سامنے عام لوگ ایسے ہی ہوں گے جیسے آج آدمی کے مقابلہ میں بن َمانس ہے۔

اب یہ پڑھئے جو اس موضوع کی وجہ ٔتسمیہ ہے۔

''ٹرانس ہیومن ازم تحریک کی سوچ کا مرکزی نکتہ ہے کہ قدرت نے جانوروں کو ان خصوصیات سے نوازا ہے جہاں تک آدمی کی رسائی نہیں۔ مثلاً کتے کی سونگھنے کی حس آدمی سے زیادہ ہے۔ عقاب کی دیکھنے کی حس تیز ہے۔ جانور زمینی ارتعاش محسوس کرکے آدمی سے پہلے زلزلہ سے واقف ہوجاتے ہیں۔ پرندوں کے دماغ میں قطب نما یا پرکار (کمپاس) انہیں سمتوں سے آگاہ کرتا ہے۔ جنگلی جانور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دیکھ سکتے ہیں۔ جنگل کے بادشاہ شیر کی بہادری کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ غرض صلاحیت کے حصول کے لئے معمولی جرثومہ سے لے کر ہاتھی اور وہیل مچھلی تک کے ڈی این اے محققین کے لئے اہم ہیں۔''

ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ اس تحریک کے تحت آدمیوں کے DNA میں جانوروں کے مذکورہ صلاحیتوں والے جین شامل کرکے باصلاحیت ٹرانس ہیومن بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ٹرانس ہیومن تحریک کی معاونت میں حیاتیات (بیالوجی) اور جینیات کے ماہرین کے علاوہ جسم سے متعلق سائنس کی تقریباً تمام شاخیں مصروف ہیں اس لئے ٹرانس ہیومن ازم تحریک تیزی سے پھیل رہی ہے۔ گوگل پر ٹرانس ہیومن ازم لکھ کر تلاش کریں تو ڈھائی سے تین لاکھ ویب سائٹس اسکرین پر ترتیب سے آجاتی ہیں۔ اس تحقیق کی رفتار کو پر اس وقت لگے جب ایک سابق امریکی نے حکومت سنبھالتے ہی ٹرانس جینک تحقیق پر عائد پابندیاں اٹھالیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے جدید ممالک میں ٹیکس دہندگان کے پیسوں کا طوفان نوع آدم کی شناخت کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے۔

جدید دنیا کی تجربہ گاہیں عرق ریزی سے آدمی اور

جانوروں کے ملاپ سے ایسے جانور بنانے کی کوشش میں ہیں جس کا تھوڑا حصہ ان کے بقول آدمی اور باقی جانور پر مشتمل ہوگا۔امریکی ریاست میں قائم خنزیر کے فارم پر ٹرانس جینک خنزیر تیار کئے جارہے ہیں جن کے جسم کا کچھ حصہ آدمی اور باقی خنزیر ہوگا۔حقیقت یہ ہے کہ ناعاقبت اندیش دنیا آدمی اور انسان کے فرق سے واقف نہیں۔اپنی تحقیق میں انہوں نے جہاں جہاں انسان کا لفظ استعمال کیا ہے،اس کی جگہ انہیں آدمی لکھنا چاہئے۔یہ آدمی اور انسان کے فرق کو سمجھ لیتے تو انہیں ایسی تحریکوں کی ضرورت نہ ہوتی۔

کئی مذاہب میں ٹرانس ہیومن کے نام پر تنظیمیں بنالی گئی ہیں اور مشترکہ طور بھی ایک بین الاقوامی ٹرانس ہیومن سوسائٹی بنائی گئی ہے جس کا نام IEET (انسٹی ٹیوٹ فار ایتھکس اینڈ امرجنگ ٹیکنالوجی) رکھا گیا ہے۔دنیا کے نامی گرامی محقق تیزی سے اس تنظیم کا حصہ بن رہے ہیں۔

رائل سوسائٹی آف سائنسز کی جانب سے کچھ عرصہ قبل سیمینار بعنوان ''کیا ہم کائنات میں اکیلے ہیں'' منعقد کیا گیا جس سے خطاب کرتے ہوئے IEET کے صدر ڈاکٹر جیمز ہگیس نے ٹرانس ہیومن کے ڈیزائن پر تفصیلی روشنی ڈالی اور دعویٰ کیا کہ وہ بہت جلد زیرو گریویٹی پر کام کرنے والے ہیومن پلس تیار کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ان کا کہنا ہے کہ اس سے خلا پر کی جانے والی تحقیق میں انقلاب آئے گا اور کائنات ہماری دسترس میں ہوگی۔

◎

دنیا کی تمام بڑی جینیٹک انجینیئرنگ کی تجربہ گاہوں میں ٹرانس ہیومنز پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانہ پر وسائل خرچ ہورہے ہیں۔ڈارپا میں چھوٹے بڑے کئی منصوبوں پر کام ہورہا ہے، ان میں ایک ''ایکسٹینڈڈ پرفارمنس وار فائٹر'' ہے۔ دستاویز انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ یہ سپر سولجر * ٹیکنالوجی سے متعلق ہے۔ اس منصوبہ کے تحت فوجیوں کے ڈی این اے میں تبدیلی کرکے انہیں سپر سولجر میں بدل دیا جائے گا۔

ڈارپا کا ایک پراجیکٹ ''کری ایٹنگ مارٹل آرگینزم'' ہے جس کا مقصد ایسی تباہ کن فورس کا عمل میں لانا ہے جس کے فوجی وحشی ذہن ہوں گے اور مقصد فقط دشمن کی موت ہوگا۔علاوہ ازیں اس تحقیق کے تحت عمر بڑھانے پر بھی کام ہورہا ہے۔چین، جاپان، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا وغیرہ سب اس طرح کے تجربات کی دوڑ میں شامل ہیں۔البتہ بعض ممالک میں حکومتی اور معاشرتی سطح پر جاننے کی کوشش کی جارہی ہے کہ یہ تحقیق آئندہ نسلوں پر کس حد تک اثر انداز ہوسکتی ہے، اور اخلاقی اور مذہبی سطح پر یہ کس حد تک صحیح اور غلط ہے۔

اقوام عالم اس تحقیق میں اتنا آگے جاچکی ہیں کہ اب آدمی اور جانور کے ''قلمی تعلق *'' کو روکنا ممکن نہیں۔ محقق دعویٰ کرتے ہیں کہ ٹرانس ہیومنز کی عمریں ہزار سال تک ہوں گی اور یہ برس خوش حالی سے بھرپور ہوں

گے۔ان کے دماغ کمپیوٹر کے ساتھ انٹر فیئنگ کی خصوصی صلاحیت کے حامل ہوں گے۔ان میں شیر جیسی طاقت اور گھوڑے جیسی قوت برداشت ہوگی۔ وہ طوفان اور زلزلہ کی آمد سے قبل از وقت آگاہ ہو جائیں گے۔

ابھی ان سہانے خوابوں کی فہرست پوری نہیں ہوئی کہ محققین کو اپنی تحقیق سے جو انوکھا اور منفرد فائدہ نظر آرہا ہے وہ ''پوسٹ جینڈر رزم'' ہے۔یعنی مردوں کو حمل کیوں نہیں ہوتا۔گویا محققین کے نزدیک ''ٹرانس ہیومن'' ایسا مشترکہ شاہکار ہوگا جس میں مرد و عورت دونوں کی خصوصیات ہوں گی۔پیدا ہونے والے بچہ کے DNA میں کئی لوگوں کے DNA کو شامل کیا جائے گا یعنی وہ بیک وقت کئی والدین کا حقیقی بچہ ہوگا۔ محقق کے بقول اس طرح کے ڈیزائن کا پہلا کام یاب تجربہ برطانیہ میں کیا جا چکا ہے جس میں ایک بچہ میں تین مختلف والدین کے ڈی این اے شامل کئے گئے۔ تاہم ایسی جینیاتی تحقیق سے بننے والے بچے زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہتے۔

ٹرانس ہیومن ازم کے حامی اپنی تحقیق کے ذریعے ماورائی دنیا میں بھی داخل ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نک باسٹرم آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ وہ ایسے ٹرانس ہیومنز کا تذکرہ کرتے ہیں جو ماورائی صلاحیتوں کا حامل ہوگا،اس میں غیر مادی وجود کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

آج دنیا مادی ترقی کا عروج دیکھ رہی ہے مگر افسوس اس بات پر ہے کہ تحقیق کے لئے الہامی کتب سے راہ نمائی نہیں لی جاتی۔کوتاہ بینی کے سبب مذہب کو فرسودہ سمجھا جاتا ہے جب کہ الہامی کتب میں تخلیق کائنات کے فارمولے موجود ہیں اور بتایا گیا ہے کہ انسان مخلوقات میں اشرف ہے،کسی جانور کی صلاحیت انسان کی صلاحیت سے زیادہ نہیں، انسان کے لئے پوری کائنات مسخر ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے،

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر تخلیق کیا ہے۔''

انبیائے کرام اور اولیاء اللہ کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے باطنی صلاحیت کے ذریعے زمان و مکان کی تسخیر کا مظاہرہ کیا۔حضرت ادریسؑ کے دور میں کشش ثقل کے قانون کے تحت اہرام کی تعمیر،حضرت یوسفؑ کا خواب کی تعبیر کا علم، حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں میں حرارت کا درجہ 1539 ڈگری سینٹی گریڈ ہونے سے لوہے کا موم ہو جانا، حضرت سلیمانؑ کی حیوانات،آبی مخلوقات ، ہوا، جنات اور دیگر مخلوقات پر حاکمیت ، ان کے دربار میں ایک بندہ کا تقریباً 15 سو میل دور سے تخت لانا،حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کرنا اور اندھے کو بینا کرنا،خاتم النبیین حضرت محمدؐ کا چاند کے دو ٹکڑے کرنا اور پھر انہیں جوڑ دینا، جس راہ پر آپؐ تشریف لے جاتے ، وہاں موجود شجر و حجر جھک کر استقبال کرتے تھے، معراج کی شب ہزاروں عالمین سے گزر کر مقام محمود پر حاضر ہونا انسانیت کی معراج ہے۔

انبیائے کرام کے روحانی علوم کے وارث اولیاء اللہ کی حیات تخلیقی صلاحیت اور کائنات پر تسخیر کی مثالوں سے لبریز ہے۔ پیران پیر دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ایک عورت نے اولاد نرینہ کے لئے دعا کی درخواست کی لیکن بیٹی پیدا ہوئی۔ گھر والے بچی کو ان کے پاس لائے اور کہا کہ آپ نے فرمایا تھا بیٹا ہوگا۔ انہوں نے بچہ پر کپڑا ڈالا اور فرمایا، گھر جا کر کپڑا اٹھانا۔ گھر پہنچ کر دیکھا تو بیٹا تھا۔

اولیاء اللہ کی زندگی میں انسانی صلاحیت کے اظہار اور ٹائم اور اسپیس کی تسخیر کے لاشمار واقعات ہیں۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں کہ،

''برصغیر اور بیرون ملک ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جنہوں نے ایک دن اور ایک وقت میں مختلف مقامات پر حضور قلندر بابا اولیاؒ کو دیکھا ہے۔ کسی کے ساتھ حضور بابا صاحبؒ نے مصافحہ کیا، کسی کو سینہ سے لگایا، کہیں چائے نوش فرمائی اور کسی کو ہدایت دی کہ ایسا کرو، ایسا نہ کرو۔ اس بات کا اظہار اس طرح ہوا کہ مجھے لوگوں نے بتایا اور کچھ لوگوں نے خطوط کے ذریعے اطلاع دی کہ قلندر باباؒ تشریف لائے تھے۔ ایک مرتبہ سوئٹزرلینڈ سے خط آیا جس میں قلندر باباؒ کی تشریف آوری سے متعلق تشکر و امتنان کا اظہار تھا اور یہ بھی تحریر تھا کہ میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق فلاں کام کر دیا ہے۔ جب میں نے یہ خط مرشد کریم کو سنایا تو عرض کیا کہ اس عرصہ میں تو آپ کہیں نہیں گئے، یہ کیا لکھا ہے؟ قلندر بابا اولیاؒ مسکرائے اور فرمایا، اہل تکوین حضرات کے پچیس (25) جسم ہر وقت کام کرتے ہیں اور جب کام کی زیادتی ہوتی ہے تو ان کی تعداد چالیس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔''

مادی سائنس جس صلاحیت کو جانوروں میں تلاش کر رہی ہے، انسان اس سے کہیں زیادہ باصلاحیت ہے۔ جانوروں میں جو نظام فیڈ کر دیا گیا ہے وہ اس کے تابع ہیں، انسان کو اس نظام کی تخلیق کے فارمولے سکھائے گئے ہیں۔ نوع آدم کا جو فرد اپنے اندر روحانی انسان سے واقف نہیں، کائنات میں اس کا درجہ جانور سے کم ہے، پھر چاہے وہ اپنے شعبہ میں محقق ہی کیوں نہ ہو!

''اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں ہیں۔'' (الاعراف: ۱۷۹)

---

*homosapien (نوع آدم) *سپر سولجر (غیر معمولی عسکری صلاحیت والا آدمی)

* قلمی تعلق (درخت میں قلم لگانے کے مترادف)

عابد محمود

ہائے ـــــ بے چارے کی اماں مرگئی ہے

(انا للہ وانا الیہ راجعون)

انہوں نے پیر کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد پوچھا، کیا آپ نے ان کا کہیں اور سے علاج کروایا ہے ـــ؟ میں نے ان کو پورا واقعہ سنایا۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا......

بابا جی فرما رہے ہیں کہ ڈاکٹر جیسا کہتے ہیں ویسا کرلیں۔ پیغام سن کر میرے اندر امید کی جلتی کرن بجھ گئی۔ میں نے کرب سے اماں کے بارے میں سوچا۔ بے چاری اماں کی صحت اس قابل نہیں اور اس پر نفسیاتی دباؤ، کیا روحانیت میں اس کا کوئی علاج نہیں ـــ؟

لیکن سر تسلیم خم ہے ـــ میں نے افسردہ لہجہ میں بیگم کو فون کیا اور بتایا کہ حکم ہے کہ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ بیگم لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی اور بولی، کیا اماں برداشت کرلیں گی ـــ؟ میں چپ رہا، میرے پاس جواب نہیں تھا۔ دل پر بوجھ کم کرنے کے لئے بیگم سے کہا، ایسا کرو ڈاکٹر سے کل کا وقت لے لو۔

اس نے دھیمے لہجہ میں جی کہا، اور میں فون بند کر کے خالی نظروں سے فون کو دیکھنے لگا۔

اندر طوفان برپا تھا، میں نے تخیل کی دنیا میں مرشد کے پاس بیٹھ کر اماں کی صحت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ اماں پچھلے بارہ سال سے فالج میں مبتلا تھیں۔ اس بیماری کے دوران غسل خانہ میں گرنے سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آپریشن کے بعد طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی۔ انہوں نے اس تکلیف کو بھی برداشت کرلیا۔ اب ان کے پیر کی خون کی نالیوں میں مسئلہ شروع ہوا۔ نالیوں میں خون جمنے سے دائیں پیر کی طرف خون کا بہاؤ رک گیا۔ پاؤں کی انگلیاں کالی ہونا شروع ہوئیں اور کاربن بن کر جھڑنے لگیں۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ دایاں پیر کاٹ دیا جائے۔ اماں کی خراب ہوتی صحت اور تکلیف کا احساس ہر وقت بے کل رکھتا۔ جب وہ درد سے بے بس ہو کر ہائے ہائے کرتیں تو نرم بستر کانٹوں میں بدل جاتا۔ ماں جیسی عظیم نعمت ہوتے ہوئے ایک بیٹا ان کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کا درد اور تکلیف تک نہیں بانٹ سکتا تھا۔ عجب عالم تھا کہ ان کی تکلیف ان کو ہی سہنی تھی۔ بعض اوقات محسوس ہوتا کہ میں سمندر کے کنارے کھڑا ہوں اور اس قدر لاچار ہوں کہ اماں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا نہیں سکتا۔

ڈاکٹر نے کل کا وقت دیا ہے۔ بیگم نے مطلع کیا۔

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور رات کو اماں کے پاس بیٹھ کر کتنی دیر سوچتا رہا کہ پاؤں کٹ جانے کی تکلیف اور نفسیاتی دباؤ کو یہ کیسے برداشت کریں گی۔ اماں کا ماتھا چوم کر میں خاموشی سے اٹھا اور ان کے لئے دعائیں کرتا رہا۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

رات کے کسی پہر اماں کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی طرف دوڑ لگائی تو دیکھا وہ پیر جس کی چھوٹی انگلی کاربن بن کر آدھی غائب ہوگئی تھی، اماں کی وہیل چیئر سے ٹکرا کر وہ پیر زخمی ہوگیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔

یہ کیا ہوا—؟ بیگم نے پریشانی سے کہا۔

میں نے فوراً ابتدائی طبی امداد کا باکس نکالا اور ایک دوا پایوڈین سے پاؤں کو اچھی طرح سے صاف کر کے مرہم پٹی کی۔ پھر ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اماں جب چاہتیں کہ میں چلا جاؤں تو آنکھیں بند کر لیتیں جیسے سو رہی ہوں تاکہ ہمیں پریشانی نہ ہو اور ہم سو جائیں۔ ماں کی محبت کا حق کیسے ادا ہو کہ خود تکلیف میں رہ کر وہ بچوں کو اس سے دور رکھنا چاہتی ہے۔

پاؤں کے زخم کی وجہ سے ان کو ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جا سکے۔ بیگم ایک ہفتہ تک صبح اور رات میں پایوڈین سے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کرتی رہیں۔ ایک ہفتہ بعد جب زخم ٹھیک ہوا تو ڈاکٹر سے دوبارہ وقت لیا اور اماں کو لے گئے۔

ڈاکٹر نے ماہر سرجنوں کی ٹیم کو بلایا تھا۔ انہوں نے پیر کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد پوچھا، کیا آپ نے ان کا کہیں اور سے علاج کروایا ہے—؟

میں نے ان کو پیر زخمی ہونے کا واقعہ سنایا۔ ڈاکٹر مسکرایا اور کہا، اماں کا پیر کاٹنے کی ضرورت نہیں، اسی طرح پایوڈین کی پٹیاں کرتے رہیں۔

میں نے خوش گوار حیرت سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ تخیل میں مرشد کریم کا مسکراتا ہوا چہرہ روشن ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے ایک نیک بندہ کے طفیل میری والدہ کو اس تکلیف سے بچا لیا۔

عمر کے اس حصہ میں چھوٹی بڑی تکالیف آتی رہیں جن کا اماں نے حوصلہ اور استقامت سے مقابلہ کیا۔ پھر ایک دن ان کو سینہ میں انفیکشن کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری ہوئی۔ ڈاکٹر کے مشورہ پر نیبولائزر دیتے رہے۔ کچھ دن افاقہ ہوا لیکن آج ان کی حالت بہتر نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھیں۔ اماں کو گاڑی میں بٹھا کر ہسپتال کی طرف گاڑی دوڑا دی۔ بیگم، بھابھی اور بڑے بھائی ہم راہ تھے۔ قریبی ہسپتال میں ڈاکٹر نشست پر موجود نہیں تھا۔ فوراً دوسرے ہسپتال کا رخ کیا اور اماں کو وہیل چیئر پر بٹھا کر عجلت میں شعبہ ایمرجنسی میں داخل ہوا۔

ڈاکٹروں نے بلڈ پریشر چیک کیا۔ دل کی دھڑکن اور بنیادی معلومات لیں اور متعلقہ ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ بلڈ پریشر اور دھڑکن

نارمل ہے تاہم سانس میں دشواری کے سبب آج رات خصوصی نگہداشت کے لئے رکھا جائے گا۔

میں نے بڑے بھائی اور بھابھی سے کہا کہ وہ گھر جا کر آرام کریں۔ میں اور بیگم ہسپتال میں رک گئے۔ اماں کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں منتقل کیا گیا اور آکسیجن لگا دی گئی تا کہ سانس لینے میں آسانی ہو۔

اماں کے پاس بیٹھ کر اماں کو دیکھ رہا تھا۔ سفید بال اور پاکیزہ چہرہ، بے اختیار ماتھا چوما پھر قریب موجود کرسی پر بیٹھ کر ان کو دیکھتا رہا۔ اس دوران نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو وہ معمول کے مطابق سانس لے رہی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر محسوس کیا کہ سانسیں بے ترتیب ہو رہی ہیں اور بیچ بیچ میں وہ سانس نہیں لے رہیں۔ فوراً ڈاکٹر کو آواز دی۔

وہاں موجود نرسیں قریب آ گئیں، سانس لینے کے لئے سینہ پر دباؤ ڈالا۔ بیگم نے اماں کو پکارا لیکن اماں کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ بیگم پریشانی سے انہیں جھنجھوڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا، سینہ پر دباؤ ڈالا اور مایوسی سے میری طرف دیکھا— میں نے مشیت الٰہی کے آگے سر جھکا دیا۔

میری بیگم نے گزشتہ پندرہ سال سے اماں کی دن رات خدمت کی تھی۔ ان کے جانے کا سن کر کانپنے لگی۔ اسے کرسی پر بٹھایا، ماتھے پر پسینہ کے چھوٹے چھوٹے قطرے نمایاں ہو گئے تھے۔

اتنا بڑا واقعہ گزر گیا لیکن میرے محسوسات جیسے سو گئے تھے۔ محسوس ہوا جیسے کچھ نہیں ہوا۔ ایک حقیقت تھی جو اپنے وقت پر درپیش ہوئی۔ دل میں لہر اٹھی اور جس رفتار سے اٹھی اسی رفتار سے غائب ہو گئی۔

آہ! اماں جی چلی گئیں— لیکن ان بے وفا آنکھوں سے خون تو کیا ٹپکتا، ایک آنسو بھی نہیں گرا۔ ہائے میری اماں! میت ایمبولینس میں گھر آئی تو کہرام مچ گیا۔ سب افسردہ تھے اور مجھ سے گلے مل کر رو رہے تھے۔ میں نے سب کو تسلی دی اور قریبی رشتہ داروں کو انتقال کی اطلاع دی۔

پیر و مرشد کی جانب سے اظہار تعزیت کے لئے فون آیا تو میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے تسلی دی، والدہ کی مغفرت اور بلند درجات کے لئے دعا کے بعد نصیحت فرمائی کہ اماں کے کپڑے غریبوں میں تقسیم کر دینا اور ذمہ داری سے ان کے لئے ایصال ثواب کرتے رہنا۔ مرشد کریم کی محبت نے مجھے سہارا دیا۔

رہ رہ کر اپنے رویہ پر تاسف ہو رہا تھا کہ والدہ نے ہمارے لئے جس طرح ایثار کیا، پرورش کی، میں کچھ بھی کر لوں، اس ایثار کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ افسوس اس بات کا بھی تھا کہ ان کی جدائی پر ایک آنسو بہانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ محسوس ہوا کہ شاید مجھے اماں سے نام نہاد محبت تھی۔ ان کا پاکیزہ معصوم چہرہ خیال میں ابھرتا تو سوائے افسردگی کی لہر کے، دل میں کوئی تاثر پیدا نہ

ہوا۔ دل پتھر بن گیا تھا۔

گھر میں لوگ اور عزیز و اقارب کے چہرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے، سب رو رہے تھے۔ مجھ سے گلے مل کر ان کی سسکیاں تیز ہو جاتیں اور میں، جس نے ماں کو کھویا تھا— بہت خاموشی سے آخری رسومات کی تیاری میں مصروف تھا۔

اماں کو لحد میں اتارنے کے بعد آخری دیدار پر بھی دل خالی تھا جیسے میں پتھر بن گیا ہوں۔ جب کچھ محسوس نہیں ہوا تو مجھے خود پر افسوس ہوا۔ سورہ بقرہ کی آیت یاد آگئی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں جن میں سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں لیکن میرا دل درد سے خالی تھا۔

''مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمہارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بڑھے ہوئے، کیوں کہ پتھروں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی اللہ کے خوف سے لرز کر گر بھی جاتا ہے۔'' (البقرۃ:۷۴)

خیال میں گم تھا کہ چچا میرے پاس آئے اور کہا، میاں! دنیا عجیب میلہ ہے، کہیں خوشی اور کہیں غم کا سماں ہے۔ پرسوں بیٹے کی شادی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں—؟

میں نے کہا، چچا جان! قدرت کا نظام ہے کہ جب بندہ دنیا میں آتا ہے تو ہم خوشیاں مناتے ہیں لیکن وہ یہاں غلطی کی پاداش میں بھیجا جاتا ہے اور جب وہ دنیا سے جاتا ہے تو دراصل وہ خالق سے ملتا ہے۔ اس سے بڑی کیا سعادت ہوگی کہ بندہ اللہ کے حضور حاضر ہو۔ میں نے مزید کہا، چچا جان! یہ بات ہم نے اپنے پیرومرشد کے پاس آکر جانی کہ مرنا دراصل وصلِ یار ہے۔ تمام اولیاء اللہ کے انتقال پر عرس کی تقریب ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا انتقال دکھ کا نہیں، خوشی کا باعث ہے۔

میں نے کہا، چچا جان! آپ انتظامات میں تبدیلی نہ کریں۔ ہم اپنے بھائی کی شادی میں ضرور شریک ہوں گے، انشاءاللہ۔

اماں کی وفات کے تیسرے دن قل کے بعد رات کو بڑے بھائی کے ساتھ میں شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے گیا۔ ہال میں داخل ہوئے، سب نے ہم سے تعزیت کی اور ہمیں اسٹیج کے قریب صوفے پر بٹھایا۔ میں خالی نظروں سے اسٹیج پر ہونے والی تقریب کو دیکھنے لگا۔

ہر طرف خوشیوں کا سماں تھا۔ لڑکے کے دوست بھنگڑے ڈال رہے تھے۔ ایک دوسرے پر مزاحیہ جملے کستے تو ماحول میں قہقہے گونجتے تھے۔ میں خاموشی سے بیٹھا ان کو دیکھتا رہا۔

نکاح کے بعد کھانا شروع ہوا۔ کھانے کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے چچا جان سے اجازت لی تو انہوں نے زبردستی بٹھا دیا اور بولے، کیا دلہن سے نہیں ملو گے؟ دلہن آجائے پھر چلے جانا۔

ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ بیٹھ گئے۔ رشتہ دار پاس بیٹھے تھے اور ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں آواز آئی کہ دلہن آرہی ہے۔

لال جوڑا پہنے، سولہ سنگھار کئے، آنکھوں میں خوشیوں کے دیئے جلائے، شرمیلی چال چلتے ہوئے دلہن اسٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے محبوب کا چہرہ یاد آ گیا — اس سے جدائی کا احساس شدت سے بیدار ہوا۔ میں گم سم تھا کہ وہ دل جو اماں کے جانے پر خالی اور ہر جذبہ سے عاری ہو گیا تھا، محبوب کی یاد اور جدائی کو برداشت نہ کر سکا، آنکھیں رم جھم برسات بن گئیں — اور میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

خوشیوں بھرے تہوار میں کسی کا یوں رونا، غیر معمولی ہے۔ سب چونک کر دیکھنے لگے۔ شادی ہال میں خاموشی چھا گئی۔ بڑے بھائی نے گلے سے لگا لیا۔ اتنے سارے لوگوں میں ایک آواز سنائی دی۔

کوئی کہہ رہا تھا،

ہائے — بے چارے کی اماں مر گئی ہے!

دریا میں مچھلیاں جو کم زور و ناتواں ہیں

گلشن میں فصل گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں
طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گل چین و باغ باں ہیں
غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی
بے فکر و بے خبر ہیں، بوڑھے ہیں یا جواں ہیں
اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں
اک خضر رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستہ پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں
خدمت میں ان کے حالؔی کہتا ہے یہ ادب سے
اس وقت رونق افزا یاں جتنے مہرباں ہیں
دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں
عرصہ ہوا کہ ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں
قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکم راں ہیں
گھڑیال اور مگر مچھ ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کم زور و ناتواں ہیں
جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

(کلام: خواجہ الطاف حسین حالؔی)

الف ــــ جیم

مادہ (matter) ایک لیکن ڈائیاں مختلف ہیں۔ ساخت میں فرق کے سبب شے مختلف نظر آتی ہے ورنہ مٹی سے بننے والی اشیا مٹی ہیں، روشنی کی دنیا میں تخلیق روشنی کی ہے اور نور کی دنیا میں موجودات پر نور غالب ہے۔

ڈائی ساخت کو کہتے ہیں اور ساخت کا تعلق مقداروں سے ہے۔ مقداریں پہچان کے لئے قائم ہیں۔ پانی میں جب تک مقداروں کا مظاہرہ نہیں ہوتا، پانی کو سب پانی کہتے ہیں۔ مقداریں ظاہر ہوتی ہیں تو اب پانی نظر نہیں آتا لیکن موجود ہوتا ہے۔ شے نگاہ کے دائرہ میں اس وقت آتی ہے جب کسی شکل میں ہو ورنہ فرد اسے لامحدود کا نام دے دیتا ہے یا اس کی موجودگی سے انکار کر دیتا ہے۔

ڈائی مادہ کو اپنے اندر محفوظ کر کے متحرک کرتی ہے۔ تحریک دائرہ کی شکل میں ہوتی ہے اور دائرہ شے کو ظاہر کرنے کے لئے کلاک وائز اور اسے غیب میں رکھنے کے لئے اینٹی کلاک وائز گھومتا ہے۔ دائرہ میں حرکت سے ایک ہی مادہ اپنے اندر مختلف لیکن معین مقداروں کو ظاہر کرتا ہے۔ مقداریں ایک دوسرے میں جذب ہوتی ہیں تو رنگ بنتے ہیں۔ ایک رنگ دوسرے رنگ میں جذب ہوتا ہے تو تیسرا رنگ بنتا ہے۔ نتیجہ میں لاشمار رنگ وجود میں آتے ہیں اور یہ بے شمار رنگ کائنات کا حصہ ہیں۔

رنگوں کی تخلیق اور ان کی روحانی تفہیم کے حوالہ سے ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ نے تخلیقی فارمولوں کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

''کائنات میں موجود تمام مادی اجسام لاشمار رنگوں میں سے متعدد رنگوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہ رنگ نسمہ کی مخصوص حرکات سے وجود میں آتے ہیں۔ نسمہ کی معین طوالتِ حرکت سے ایک رنگ بنتا ہے۔ دوسری طوالتِ حرکت سے دوسرا رنگ۔ اس طرح نسمہ کی لاشمار طوالتوں سے لاشمار رنگ وجود میں آتے رہتے ہیں۔ ان رنگوں کا عددی مجموعہ ہر نوع کے لئے الگ الگ معین ہے۔ اگر گلاب کے لئے رنگوں کا عددی مجموعہ ''الف'' معین ہے تو ''الف'' عددی مجموعہ سے ہمیشہ گلاب وجود میں آئے گا، کوئی اور شے وجود میں نہیں آئے گی۔ اگر آدمی کی تخلیق رنگوں کی ''جیم'' تعداد سے ہوتی ہے تو اس مقدار سے دوسرا حیوان نہیں بن سکتا۔ صرف نوع آدم کے افراد وجود میں آسکتے ہیں۔''

کائنات میں جو رنگ قلندر شعور سے نظر آتے ہیں، مجموعی طور پر ان کی تعداد تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار ہے جب کہ محقق اب تک کم وبیش ساٹھ رنگ دریافت کر سکے ہیں۔ قوس قزح میں نظر آنے والے رنگوں کی تعداد سات ہے۔ فی الواقع رنگ کتنے ہیں، اس کا علم اللہ کو ہے۔

قلندر شعور سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ کائناتی افراد کی بنیاد رنگ ہیں۔ رنگ جب بہاؤ کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ایک کرنٹ پیدا ہوتا ہے، یہ کرنٹ زندگی کی تحریک کا سبب ہے۔ آدمی سنکھیا کھا کر اس لئے مر جاتا ہے کہ سنکھیا کے اندر رنگ کے بہاؤ یعنی الیکٹری سٹی کا وولٹیج آدمی کے اندر کام کرنے والے وولٹیج سے زیادہ ہے۔ ساٹھ واٹ بجلی کے بلب میں کئی ہزار واٹ بجلی دوڑا دی جائے تو بلب فیوز ہو جاتا ہے۔

ہم جب کرنٹ کو چھوتے ہیں تو جھٹکا لگتا ہے۔ جھٹکا لگنے سے مراد ہے کہ آدمی کے اندر دوڑنے والی بجلی میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ہلچل یا تلاطم کو پورا جسم محسوس کرتا ہے۔ اگر آدمی کے اندر کام کرنے والے بجلی کا وولٹیج کم زور ہے یا مقدار سے کم ہے تو آدمی گر جاتا ہے اور بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آدمی ایسا طریقہ اختیار کرے جس میں بجلی کا بہاؤ براہ راست زمین میں جذب نہیں ہوتا تو اسے شاک یا جھٹکا نہیں لگتا۔

بجلی میں نیگیٹو اور پازیٹو دو چارج ہیں۔ ان کے تعامل سے زندگی حرکت میں رہتی ہے۔ منکشف ہوتا ہے کہ کائناتی تخلیق میں نیگیٹو یا پازیٹو اصول کے تحت ایسی نوع موجود ہے جو بجلی کے بہاؤ کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور ایسے تخلیقی عوامل ہیں جو اپنے اندر بجلی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لاشعور راہ نمائی کرتا ہے کہ ہم تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر ہر قسم کی غیر مرئی صلاحیتوں کو متحرک کر سکتے ہیں۔ جب ایک آدمی اپنے اندر دور کرنے والی بجلی یا نسمہ سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ بجلی کے بہاؤ کو روک سکتا ہے اور اس ذخیرہ سے ماورائی دنیا میں بغیر کسی وسیلہ کے پرواز بھی کر سکتا ہے۔

بجلی کے نظام سے واقف ہونے کے بعد اس کے اندر ایسی سکت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ارادہ اور اختیار سے آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے اس زمین کی طرح کہکشاں میں بے شمار زمینیں آ جاتی ہیں۔ جس طرح وہ اپنی زمین پر آباد اللہ کی مخلوق کو دیکھتا ہے اسی طرح کھربوں دنیاؤں کا بھی مشاہدہ کر لیتا ہے۔ وہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ ہماری دنیا جیسی لاشمار دنیائیں ہیں۔ ان میں آدمی بستے ہیں، ان میں افزائش نسل کا سلسلہ ہے، خورد و نوش، رہن سہن، کھیتی باڑی، کاروبار اور مرنا جینا سب موجود ہے۔

---

*نسمہ (جسم سے نو (۹) انچ کے فاصلہ پر روشنی کا ہیولی جو مادی آنکھ سے نظر نہیں آتا)

نفیسہ شاکر

ہم سوچتے کیوں ہیں ــــ؟

کھلاڑیوں کو میدان میں بھیجنے سے پہلے بتایا جاتا ہے کہ جیت کا تعلق مضبوط اعصاب اور حاضر دماغی سے ہے۔ آدھی جیت میدان میں اور آدھی دماغ کے اندر ہے۔ جس نے اعصاب کو زیر کیا، فتح اس کے نام ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کا ایک طریقہ اپنے اندر دیکھنا اور خیالات کو پڑھنا ہے۔

حافظہ پر زور دیں اور کسی سے ملاقات یاد کریں، کون سی بات ایسی ہے جو کم وبیش سب کی زبان پر ہوتی ہے ــــ؟ جواب ہے کہ ''مصروفیت بہت ہے''۔ دوست احباب یا رشتہ دار سے پوچھیں کہ کہاں غائب ہیں نظر نہیں آتے؟ وہ کہتے ہیں کہ ''مصروفیت زیادہ ہے، وقت نہیں ملتا''۔ ہم بھی دوسروں کو یہی جواب دیتے ہیں کہ ''سر کھجانے کی فرصت نہیں''۔

موجودہ دور میں آپ کیسے ہیں کہ سوال پر ''خیریت سے ہوں''، کہنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ کیا ہم واقعی اتنے مصروف ہیں جتنا خود کو بتاتے ہیں؟ کیا معاش کے علاوہ ہماری مصروفیت، مصروفیت ہے؟ نوبت ان الفاظ تک آ پہنچی ہے، ''اتنا مصروف ہوں کہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔'' کیا یہ معقول جواب ہے؟

دماغ کسی لمحہ خیال سے خالی نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی سوچ گردش کرتی رہتی ہے۔ ہم ایسا کیا سوچ رہے ہیں کہ ہمارے پاس سوچنے کا وقت نہیں؟ یہ کیسا جواب ہے جو روز مرہ گفتگو کا حصہ بن گیا ہے؟ ہر شخص اتنا مصروف کیوں رہنا چاہتا ہے کہ اس کے پاس اپنے لئے سوچنے کا وقت نہیں ــــ؟

ہر شخص روزمرہ معمول کے بعد وقت ملتے ہی خود کو دوبارہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی ویڈیو گیم کھیلتا ہے، کوئی دوستوں میں بیٹھتا ہے، کوئی ٹی وی دیکھتا ہے، کوئی خیالی پلاؤ بناتا ہے اور کوئی تفریحی مراکز کا رخ کرتا ہے۔ کام کے اوقات کے بعد خود کو مصروف رکھنے کے لئے زیادہ تر رجحان ان سرگرمیوں کی طرف ہے جن سے ذہن مزید الجھن میں مبتلا ہوتا ہے۔

فرد چاہتا ہے کسی نہ کسی طریقہ سے اس کا وقت گزر جائے۔ ان میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو کام کے بعد غور وفکر کو وقت دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے خیالات کو پڑھنے اور غور وفکر کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہو گیا ہے۔ جن معاشروں میں تفکر کو اہمیت دی جاتی ہے وہاں بھی

تقریباً ہر دوسرے شخص نے خود کو جدید برقی آلات میں مشغول کردیا ہے، اپنے اندر دیکھنے سے لوگ گھبراتے ہیں۔تھوڑی فرصت میسر آتی ہے اور موبائل فون میں مشغول ہوجاتے ہیں۔مل جل کر بیٹھنے اور ایک دوسرے کو سننے کے بجائے سوشل میڈیا پر وقت گزارنا ماحول اور خود سے فرار ہے۔

انسانی رویوں پر کی جانے والی تحقیق یہ ہے کہ تنہائی میں خیالات سے گریز کے لئے خود کو غیر ضروری سرگرمیوں میں مصروف رکھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔لوگ اپنے اندر دیکھنے یا غور وفکر سے گریز کے لئے کس حد تک جاتے ہیں اس بارے میں پڑھنے سے پہلے ورجینیا یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر ٹموتھی ولسن کا تجزیہ پڑھیں جنہوں نے تحقیقی رویہ میں خامی کی نشان دہی کی اور اپنے ہم عصر خواتین وحضرات میں تشویش پیدا کردی ہے۔وہ کہتے ہیں،

''مصروف رہنے کے لئے ہم نے خود کو برقی آلات سے وابستہ کردیا ہے۔زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ ماہرین نفسیات رویوں پر تحقیق کرتے ہیں تو اس میں بھی مادی آلات کی مداخلت ہوگئی ہے۔ محققین کو ادراک نہیں کہ وہ اندرونی رویوں سے واقف ہونے کے لئے ظاہری چیزوں پر انحصار کررہے ہیں۔وہ لوگوں کو مادی آلات میں مشغول کرکے ان کے رویوں کا اندازہ لگاتے ہیں۔اس طرف توجہ نہیں دی گئی کہ اگر لوگوں کو کوئی چیز ہاتھ میں دیئے بغیر کچھ وقت کے لئے اکیلا بٹھایا جائے تو کیا نتیجہ سامنے آئے گا۔''

عام افراد ایک طرف ـــ لوگوں نے مسائل سے فرار کے لئے جن مادی چیزوں کا سہارا لیا ہے، محقق غیر ارادی طور پر رویوں کے مطالعہ کے لئے اپنی تحقیق میں اِن اشیا کو شامل کررہے ہیں جب کہ اشیا خود مسائل ہیں۔مثلاً دو گروپ بنا کر ان کو الگ الگ سرگرمی دے دی گئی، اب ان کے رویوں کا اندازہ لگایا جارہا ہے۔یہ نہیں سوچا گیا کہ ان کو کچھ وقت کے لئے تنہا بٹھایا جائے تاکہ معلوم ہو یہ اپنے ساتھ کتنی دیر تک بیٹھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ٹموتھی کی نگرانی میں رویوں کا جائزہ لینے کے لئے سات سو مختلف لوگوں پر گیارہ تجربات کئے گئے۔ اکثر شرکا نے کہا کہ انہیں کمرے میں چھ سے 15 منٹ تک اکیلے بیٹھنے سے شدید الجھن محسوس ہوئی۔

ایک تجربہ میں لوگوں کو غور وفکر کے لئے اکیلا چھوڑ دیا گیا تو ان میں سے 64 فی صد مرد اور 15 فی صد خواتین خیالات سے گھبرا گئے، ذہنی انتشار کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے الیکٹرک شاکس کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔

یہ تجربات گھر سے لے کر لیبارٹری ہر جگہ کئے گئے۔ کسی کو کہا گیا کہ وہ سالانہ چھٹیوں کے بارے میں سوچے تو کسی کو اپنے بارے میں منصوبہ بندی کا ہدف

دیا گیا وغیرہ۔ اکثریت نے خود کو وقت دینا پسند نہیں کیا۔

محققین کے نزدیک وجہ یہ ہے کہ پریشان ذہن کو ناخوش گوار باتیں یاد آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تقریباً ہر فرد منفی باتوں کے بارے میں زیادہ سوچتا ہے۔ ناانصافی ہوئی ہو تو تنہائی میں محرومی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ لوگ خیال میں معنی پہنانے تک محدود ہو گئے ہیں اور ان معانی کو خود پر حاوی کر دیا ہے۔

ہر شخص نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں پڑھیں جنہوں نے پہلے خود سکون حاصل کیا پھر انسانیت کو سکون کا عرفان دینے کی کوشش کی۔ کیا ان کی سوانح حیات میں مشکلات کا ذکر نہیں ہوتا؟ کیا ان کی زندگی آسان تھی؟ انہیں کوئی رکاوٹ درپیش نہیں ہوئی؟ پھر وہ کس طرح رکاوٹوں کا سامنا کر کے خوشی اور غم دونوں سے بے نیاز ہو گئے—؟

خالق و مالک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

''جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ ہر شے اللہ کی طرف سے ہے۔'' (آل عمران: ۷)

رکاوٹیں زندگی کا حصہ ہیں، فرد کی تربیت کرتی ہیں، اور انہیں مضبوط بنانے کے لئے آتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ رکاوٹیں باہر نہیں ہیں، خیال کی شکل میں اندر موجود ہیں۔ اپنے اندر رکاوٹوں کا سامنا کرنے والے کو دنیا کی کوئی شے تسخیر نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ خود اپنے آپ کو تسخیر کر لیتا ہے۔

کھلاڑیوں کو میدان میں بھیجنے سے پہلے بتایا جاتا ہے کہ جیت کا تعلق مضبوط اعصاب اور حاضر دماغی سے ہے۔ آدھی جیت میدان میں اور آدھی دماغ کے اندر ہے۔ جس نے اعصاب کو زیر کیا، فتح اس کے نام ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کا ایک طریقہ اپنے اندر دیکھنا اور خیالات کو پڑھنا ہے۔

حالات کی سمجھ حالات کو قبول کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پُرسکون ذہن کے حصول میں پہلی رکاوٹ اللہ سے دوری ہے جو بے یقینی کا سبب ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

جس معاشرہ میں تربیت پا کر بچہ جوان ہوتا ہے، وہ معاشرہ اس کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ معاشرہ میں شک کی وجہ سے عقیدہ فریب پر مبنی ہوتا ہے۔ شک میں الجھ کر ذہن صحیح اور غلط میں تجزیہ کے قابل نہیں رہتا۔ ہر معاشرہ میں خود کو حقیقت کے برعکس ظاہر کرنے کی سوچ نمایاں ہوتی ہے کیوں کہ سب برائیوں کو چھپاتے اور اچھائیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ تضاد کے سبب زندگی گزارنے میں مشکلات پیش آتی ہیں جن کا حل فرد کے پاس نہیں ہوتا۔ اب وہ قدم قدم پر خطرہ محسوس کرتا ہے۔ شک کی بنا پر خلیات میں ٹوٹ پھوٹ سے عمل میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، کوشش بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے اور اعصاب کو نقصان پہنچتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: 'لا ریب ہے یہ کتاب اور اس کو ہدایت دیتی ہے جس کا یقین غیب پر ہے۔' یہاں اللہ

تعالیٰ نے دو باتیں کہی ہیں۔'لاریب' کہہ کر'ریب' یعنی شک کی نفی کر دی۔ اب صرف غیب باقی رہ گیا جس کو یقین کا درجہ حاصل ہے — معانی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ دماغ میں شک کو جگہ دینے کی اجازت نہیں دیتے۔ صرف یقین کو اس بات کی اجازت ہے کہ آدمی کے ذہن میں داخل ہو جائے۔ اسی کا نام ایمان بالغیب ہے جو ہدایت دیتا ہے۔''

ہمیں ہر وقت اداس رہنے اور مسائل کے بارے میں سوچنے کی عادت ہے۔ ہم شام کو ٹیرس پر بیٹھتے ہیں، ہاتھ میں موبائل نہ ہو اور ہمارے علاوہ وہاں کوئی موجود نہیں، موسم یا مناظر کے بارے میں سوچنے کے بجائے خیال آتا ہے کہ ہم اکیلے ہیں۔ نتیجہ میں اکیلے پن سے متعلق خیالات آنا شروع ہوتے ہیں اور اداسی کی کتاب کھل جاتی ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم اکیلے تھے لیکن خیال نہیں آیا کیوں کہ ہم نے غیر ارادی طور پر ماحول میں موجود ہر شے سے اپنائیت محسوس کی اور خود کو اکیلا نہیں سمجھا۔ مسئلہ سمجھ کا ہے، اس سے پہلے مسئلہ نہیں تھا۔

منفی باتوں میں رہنے کی وجہ سے سکون میں بے سکونی، یقین میں بے یقینی اور خوشی میں ناخوشی کا پہلو تلاش کر لینا عام ہو گیا ہے۔ جن خیالات کو ہم قبول نہیں کرتے، ان کے آنے سے پریشان ہو جاتے ہیں اور فوراً موبائل فون ہاتھ میں لے لیتے ہیں تاکہ توجہ بٹ جائے۔ موبائل اٹھانے کی مشق اتنی قوی ہو گئی ہے کہ ہاتھ غیر ارادی طور پر موبائل کی جانب جاتا ہے۔ یہ حقیقی دنیا سے فرار حاصل کرنے کے لئے الوژن کی دنیا میں قدم رکھنا ہے۔ جب موبائل فون اور دیگر برقی آلات نہیں تھے تو اس دور میں لوگ کیا کرتے تھے —؟

مشینوں میں رہ کر زندگی گزارنے سے احساس پردہ میں چھپ گیا ہے اور مشین کی صفت غالب ہو گئی ہے۔ مشین حس سے محروم ہے، اس کے اندر احساس کہیں اور سے داخل ہوتا ہے۔

ہم دوسروں کو اچھے مشورے دیتے ہیں لیکن وقت آنے پر خود ان مسائل میں الجھ جاتے ہیں۔ غور کیا گیا تو دو وجوہات سامنے آئیں۔

۱۔ اپنے بارے میں سوچتے ہوئے فرد جانب دار ہوتا ہے کیوں کہ وہ حالات کا توقعات سے موازنہ کرتا ہے۔ ذہنی کشمکش سے نجات کے لئے غیر جانب دار سوچ ضروری ہے۔

۲۔ یک سوئی کی عادت نہیں ہے۔ خود کو نظر انداز کر کے مادیت میں مشغولیت کو مصروفیت سمجھا جاتا ہے، یہ عمل ذہنی انتشار ہے۔

بڑے بزرگوں کی باتیں زندگی کا نچوڑ ہیں۔ جن مراحل سے ہم گزر رہے ہیں، وہ اس سے گزر چکے ہیں۔ بڑوں کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔ بزرگ محاسبہ کی تلقین کرتے ہیں کہ سوچا جائے ایک کام کرتے ہوئے سکون کیوں حاصل ہوتا ہے، اور دوسرے کام سے بے سکونی کیوں ملتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دن میں

کم از کم ایک وقت مقرر کر کے یا رات کو سونے سے پہلے دن بھر کا محاسبہ کریں۔ محاسبہ کرنے والے لوگ تنہائی سے نہیں گھبراتے، وہ موقع تلاش کرتے ہیں کہ کچھ وقت اپنے لئے میسر آئے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی خیال سے پریشان ہیں تو کچھ وقت کے لئے تصور کیجئے کہ یہ مسئلہ آپ کا نہیں، کسی اور کا ہے۔ مسئلہ کا جائزہ لے کر بتایئے کہ آپ اسے کیا مشورہ دیں گے۔ جو مشورہ آپ نے اسے دیا، وہی مشورہ آپ کے مسئلہ کا حل ہے۔

معاشرہ مغرب کا ہو یا مشرق کا — تجزیہ بتاتا ہے کہ تربیت نہیں ہے یا تربیت کی سمت درست نہیں ہے۔ پرورش کے دوران بچہ کی شخصیت کو مضبوط کرنے میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ اللہ سے تعلق سے واقف ہو

۲۔ والدین سے دوستی

اللہ ہر بندہ سے ربط میں ہے کیوں کہ اللہ کی صفات مخلوق میں لائف اسٹریم ہیں۔ یہ آدمی ہے جو اللہ سے واقف نہیں ہے، اسی لئے حالات و واقعات سے خوف زدہ ہے۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے،

''سن رکھو! بے شک اللہ کے دوستوں کو خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔'' (یونس: ۶۲)

اولیاء اللہ جہاں ہوتے ہیں وہاں خلقت کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تنہائی کی تلاش میں جنگل کا رخ کرتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد جنگل — منگل بن جاتا ہے۔ اللہ سے محبت کی لہریں اولیاء اللہ کے اندر مقناطیسی کشش کا کام کرتی ہیں اور لوگ جوق در جوق ان کے در پر حاضر ہوتے ہیں۔

آدمی کے ذہن میں کثرت ہے، اللہ کے دوست کا ذہن وحدت پر مرکوز ہوتا ہے۔ کثرت مادی اشیا میں سکون تلاش کرتی ہے، یک سو ذہن وحدت سے ربط میں رہتا ہے اور دنیا میں رہ کر دنیا کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہر شے میں اللہ کی صفات دیکھتا ہے۔

عظیمی صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ خیالات کو روکنے کا طریقہ بتایئے تاکہ ذہنی الجھن سے نجات ملے۔

فرمایا: ذہنی الجھن سے نکلنے کا طریقہ خیالات کو روکنا نہیں، انہیں گزرنے دینا ہے تاکہ ذہن انتشار سے خالی ہو جائے پھر صرف ایک خیال باقی رہے گا اور وہ اللہ کا خیال ہے۔

ہر دور میں یہ بات کسی نہ کسی صورت میں سامنے آتی رہی ہے کہ انسان صرف جسمانی حرکات اور خارجی کیفیات کا نام نہیں۔ انسان کے اندر ایک دائرہ مادی تحریکات سے آزاد ہے اور اسی دائرہ سے تمام خیالات و افکار مادی دائرہ کو ملتے ہیں۔ یہ دائرہ اصل انسان ہے اور اسے عرف عام میں ''روح'' کہا گیا ہے۔ اہل روحانیت نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر

آدمی اپنے قلب، اپنے من کے اندر سفر کرے تو اس کے اوپر روح کی صلاحیت کا انکشاف ہوتا ہے۔

باطنی علوم کے ماہرین نے اندر کی دنیا سے واقف ہونے کے لئے سالک کے لئے جو اسباق مرتب کئے ہیں، سب کا منشا یقین کی پختگی ہے۔ یقین کے لئے سب سے پہلے بیدار کی جانے والی صلاحیت کو عام الفاظ میں خالی الذہن ہونا کہتے ہیں۔ خالی الذہن ہونا روحانی علوم کا پہلا سبق ہے جس کے تحت طالب علم انتشار سے آزاد ہو کر دنیا میں سکون حاصل کر لیتا ہے۔

خالی الذہنی کیا ہے ــــ؟

''خالی الذہن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ذہن میں کوئی خیال نہ آئے۔ خالی الذہن ہونے سے مراد توجہ کو کسی ایک نقطہ پر اس طرح قائم رکھنا ہے کہ آدمی اپنے ارادہ سے کوئی دوسرا خیال ذہن میں نہ لائے۔ انخلائے ذہن کی دوسری تعریف یہ ہے کہ ذہن کو تمام خیالات سے ہٹا کر ایک خیال پر اس طرح متوجہ رکھا جائے کہ دوسرے تمام خیالات ناقابل توجہ ہو جائیں۔ جب ہم خالی الذہن ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں مشکلات پیش آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں خالی الذہن ہونے کی عادت نہیں ہے۔ لیکن مسلسل مشق کے ذریعے یہ صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے۔ خالی الذہن ہونے کا اصطلاحی نام مراقبہ ہے۔ خالی الذہن کی کیفیت روزمرہ کئی کاموں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔'' (کتاب مراقبہ)

مراقبہ کیا ہے ــــ؟

خواب اور بیداری کے حوالہ سے مراقبہ کی تعریف کی جائے تو کہا جائے گا کہ مراقبہ بیدار رہتے ہوئے خواب کی دنیا میں سفر کرنے کا نام ہے۔ بالفاظ دیگر مراقبہ اس عمل کا نام ہے جس میں آدمی خواب کی کیفیت کو اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کا شعور بیدار رہتا ہے۔ مراقبہ میں وہ تمام حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں جن سے کوئی شخص حواس کی تبدیلی کے وقت گزرتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے سانس کی رفتار آہستہ کر لی جاتی ہے۔ اعضائے جسمانی کو ڈھیلا چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جسم غیر محسوس ہو جائے۔ ذہنی طور پر انسان تمام افکار و خیالات سے ذہن ہٹا کر ایک تصور کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اگر مراقبہ کرنے والے کسی شخص کو دیکھا جائے تو بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ ایک آدمی آنکھیں بند کئے سو رہا ہے لیکن فی الحقیقت اس کا شعور اس طرح معطل نہیں ہوتا جیسا کہ خواب میں ہوتا ہے، چناں چہ مراقبہ میں آدمی بیدار رہتے ہوئے اس کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے جو خواب دیکھتے ہوئے طاری ہوتی ہے۔ جوں ہی شعوری حواس پر سکوت طاری ہوتا ہے بیداری کے حواس پر خواب کے حواس کا غلاف چڑھ جاتا ہے۔ اس حالت میں آدمی اپنے ارادہ سے ان تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو استعمال کر سکتا ہے جو خواب میں کام کرتی ہیں۔ (کتاب: مراقبہ)

سید اسد علی

تقدیر معلّق ــــ تقدیر مُبرم

مصر میں خالی قینچی چلانے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے ہوا میں موجود مخلوق کٹ جاتی ہے اور انہیں غصہ آتا ہے۔

ببلو! انٹرویو کے لئے نہیں جانا؟ منہ ہاتھ دھو لے میں ناشتہ بناتی ہوں۔ تیرے ابا کہہ کر گئے ہیں کہ اسے وقت پر بھیج دینا۔ ببلو کے لئے آنکھ کھولنا مشکل ہوگیا، نیند کا غلبہ تھا۔ سر تک چادر تان لی کہ ماں کی آواز نہ آئے۔ انٹرویو کی پروا نہیں تھی۔ اماں دوبارہ آئیں اور اس بار بستر سے اٹھا کر دم لیا۔ ببلو نے بوجھل قدموں سے غسل خانہ کا رخ کیا اور بے دلی سے تیار ہونے کے بعد دیر تک ناشتہ کرتا رہا۔ فائل اٹھائی اور اماں کو اللہ حافظ کہتا ہوا گھر سے نکلا۔ وہ انٹرویو کے تجربات سے تنگ آ گیا تھا۔ حالات سے مایوس سڑک پر چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ قسمت کی لکیریں کب روشن ہوں گی۔

وہ ہر بار انٹرویو سے پہلے تقدیر کا لکھا معلوم کرنے کے لئے اس فٹ پاتھ کا رخ کرتا جہاں فال نکالنے والا بیٹھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے دوستوں کو ملازمت کی خوش خبری فال نکالنے والے نے دی تھی۔

فٹ پاتھ پر ببلو جیسے کئی نوجوان طوطے کی چال کے منتظر تھے۔ دیوار پر خوب صورت طوطے کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بینر پر تعریفیں اور دعوے درج تھے۔ کچھ دیر کے بعد اس کا نمبر آیا تو فال والے کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق ابھری اور اگلے لمحہ وہ انجان بن گیا۔

ببلو نے مدعا بیان کیا کہ انٹرویو ہے معلوم کرنا ہے کہ آج کا دن کیسا رہے گا، کیا مجھے اس کمپنی میں انٹرویو کے لئے جانا چاہئے؟ ادھیڑ عمر شخص بولا، تمہارے لئے میں اپنے سب سے پیارے اور ذہین طوطے کو پیش کروں گا لیکن ــــ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

ببلو نے بے صبری سے پوچھا، لیکن کیا ــــ؟

اس کی بخشش زیادہ ہے۔

ببلو نے جیب سے پیسے نکالے اور فال والے کی طرف بڑھائے۔ اس نے سبز رنگ کے خوب صورت طوطے کو فال نکالنے کا اشارہ کیا۔ طوطا ناز و انداز سے لفافوں کی طرف بڑھا اور درمیان والے لفافے کو چونچ میں دبا کر نکال لیا۔

فال والے نے لفافہ کھولا، پرچہ پر تحریر تھا،

''آج کے دن جو کام کیا جائے گا وہ الٹ ہوگا۔''

بلو کے چہرہ پر مایوسی پھیل گئی۔ وہ کمپنی جانے کے بجائے گھر جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔ فائل میز پر پھینکتے ہوئے اماں سے کہا، انٹرویو ہوگیا ہے، کمپنی والے فون کر کے مطلع کریں گے۔

آدمی قسمت یا مقدر سے واقف نہیں البتہ نصیب میں آسانی کی خواہش رکھتا ہے۔ کچھ افراد عملی کوشش کر کے اور کچھ دیگر طریقوں سے قسمت بدلنا چاہتے ہیں لیکن کیا قسمت فرد کے ہاتھ میں ہے ــــ؟

قسمت کے حوالہ سے نظریات متضاد ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ قسمت ایسی فلم ہے جس میں تبدیلی کا اختیار نہیں لیکن عوام میں رائج توہم پرستی اس رائے سے متفق نہیں۔ وہ روزمرہ واقعات کو کسی نہ کسی شے سے منسوب کر دیتے ہیں جیسے آئینہ ٹوٹنا، کالی بلی کا گزرنا وغیرہ۔ توہم پرستی ایک خطہ تک محدود نہیں، ہر رنگ و نسل کے افراد اس میں مبتلا ہیں۔

13 تاریخ میں منگل کا دن ہو تو ہسپانوی قوم اسے بدقسمتی کی علامت سمجھتی ہے۔ چین میں ایک طبقہ آٹھ کے ہندسہ کو مبارک اور چار کو منحوس خیال کرتا ہے۔ چینیوں کا ماننا ہے کہ خوش قسمتی گھر کے اگلے دروازہ سے داخل ہوتی ہے اس لئے وہ صفائی کر کے کچرا پچھلے دروازہ سے باہر نکالتے ہیں۔ آئرلینڈ میں دلہنیں لباس یا زیورات میں خوش قسمتی کے لئے چھوٹی گھنٹی استعمال کرتی ہیں۔ خالی بالٹی لے کر پھرنا روس میں برا شگون ہے۔ فن لینڈ کے لوگوں کو یقین ہے کہ مکڑی کو مارنے سے اگلے دن بارش ہوتی ہے۔ پرتگالی سمجھتے ہیں کہ الٹا چلنے سے برائی راستہ دیکھ لیتی ہے۔ مصر میں خالی قینچی چلانے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے ہوا میں موجود مخلوق کٹ جاتی ہے اور انہیں غصہ آتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور نیدرلینڈ کے شہری شادی کے بعد گھر کے باہر صنوبر کا درخت لگاتے ہیں تاکہ ازدواجی تعلقات مضبوط ہوں۔ برطانیہ میں چیونٹیوں کی آمد برے موسم اور ان کا قطار میں چلنا بارش ہونے کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ مغرب میں سفید مرغی کو رحمت اور سیاہ مرغی کو شیطانی قوت گمان کیا جاتا ہے۔ ترکوں کا ماننا ہے کہ دو ہم نام لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر مانگی گئی دعا پوری ہوتی ہے۔ جاپان میں کالی بلی خوش قسمتی کی علامت ہے۔ سربیا میں نوکری کے لئے انٹرویو پر جانے سے پہلے پانی گرانے کو خوش قسمتی گردانا جاتا ہے۔ ایشیا میں الٹی آنکھ کا پھڑکنا مصیبت اور سیدھی آنکھ کا پھڑکنا نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ گھر کے قریب بلیوں کا رونا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا، آئینہ ٹوٹنا، شام کو جھاڑو دینا بدشگونی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ستاروں کے ٹوٹتے وقت کی جانے والی خواہش پوری ہوتی ہے۔ سورج گرہن کے وقت کراچی میں ساحل سمندر پر بچوں کو ریت میں دبایا جاتا ہے۔ اعتقاد ہے کہ ذہنی اور جسمانی معذوری دور ہوتی ہے۔

شیخ سعدی حکایت بیان کرتے ہیں،

''کسی دیہاتی کا گدھا مر گیا تو اس نے اپنے باغ کو نظر بد سے بچانے کے لئے گدھے کا سر درخت کی شاخ پر لٹکا دیا۔ صاحب دانش کا باغ سے گزر ہوا تو گدھے کا سر نظر آیا۔ وجہ معلوم ہونے پر اس نے کہا، گدھا کمر پر برسنے والے ڈنڈوں کو نہ روک سکا، نظر بد کیا روکے گا! یہاں تک کہ مار کھا کھا کر مر گیا۔ باغ کے مالک سے کہا، ٹوٹکوں سے نظر بد نہیں رکتی، قسمت میں جو لکھا ہے وہ پورا ہوتا ہے۔''

ہم نہیں جانتے کہ خوش نصیبی اور بدنصیبی کیا ہے۔ مفروضات پر زندگی گزارتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ توہم پرست تھا۔ وہم تھا کہ صبح اٹھنے کے بعد سب سے پہلے بدصورت شخص کو دیکھنے سے حکومت کو خطرہ ہوسکتا ہے اس لئے اگر ایسا کوئی شخص بادشاہ کے قریب آئے تو حکم تھا کہ سر قلم کر دیا جائے۔ خادموں کی کوشش ہوتی کہ صبح کے وقت بادشاہ کا سامنا خوش شکل شخص سے ہو۔ ایک بار بادشاہ سیر کے لئے نکلا تو نظر بھکاری پر پڑی۔ سخت ناگوار گزرا۔ گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم دیا۔

پھانسی کے وقت بھکاری سے آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے کہا، جانتا ہوں کہ مجھے پھانسی ہوگی، بچنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ آخری خواہش ہے کہ بادشاہ سے ملاقات کروادیں۔ سپاہی بولا یہ ناممکن ہے کیوں کہ تم منحوس ہو۔ بھکاری نے کہا، اچھا پردہ کے پیچھے سے بات کروادو۔ خواہش بادشاہ تک پہنچائی گئی، اس نے آمادگی ظاہر کی۔ ملاقات کا وقت آیا تو بھکاری نے پردہ کے پیچھے سے بادشاہ سے کہا، اگر میں آپ کے لئے منحوس ہوتا تو جس جگہ آج میں ہوں، آپ ہوتے اور سلطنت ختم ہو چکی ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس صبح اٹھ کر میں نے سب سے پہلے آپ کی شکل دیکھی اور پھانسی کے تختہ تک پہنچ گیا۔ بتایئے منحوس کون ہے ــــ؟ اگر آپ صبح نظر نہ آتے تو مجھ پر یہ مصیبت نہ آتی۔ بادشاہ سناٹے میں آ گیا اور حواس بحال ہونے پر بھکاری کو رہا کرنے کا حکم دیا۔

بدشگونی پر یقین کا حقیقت سے تعلق نہیں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں،

''نبی اکرمؐ کے زمانہ میں سورج گرہن کے روز آپؐ کے صاحب زادہ ابراہیم کی وفات ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا، سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، انہیں کسی کی زندگی یا موت کی وجہ سے گہن نہیں لگتا۔ پس جب تم انہیں گہن کی حالت میں دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، نماز ادا کرو حتیٰ کہ گہن ختم ہو جائے۔''

(صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور پاکؐ نے فرمایا، بدشگونی بے یقین ہونے کی علامت ہے۔ ایک اور حدیث مبارک ہے،

''ہم میں سے کون ہے جسے وہم نہ آتا ہو لیکن اللہ تعالیٰ

توکل کے سبب اسے دور فرما دیتے ہیں۔'' (ابوداؤد)

توہمات کی وجہ سے مسائل پر ہمارا جواب ہوتا ہے کہ،

۱۔ ستارے گردش میں ہیں۔

۲۔ مصیبت نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔

۳۔ کیا کریں۔۔۔ تقدیر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے!

ان کی تصحیح کے لئے قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''تم لوگوں پر جو بھی مصیبت آئی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے۔ اور اللہ تمہارے بہت سے قصور درگزر کر دیتا ہے۔'' (الشوریٰ: ۳۰)

قسمت بد لنے اور دوسروں کی قسمت پر اثر انداز ہونے کے لئے اسفل (پست) ذہن لوگ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں تاکہ من پسند نتائج حاصل ہوں۔ ایک طریقہ کالا جادو ہے۔ سفلی علوم کے ماہرین لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دعویٰ میں صداقت کی تصدیق پہلے ہوئی نہ آج کے دور میں کی جاتی ہے البتہ ہزاروں سال سے لوگوں کا جادو پر یقین ہے اور اپنے کام کروانے کے لئے سفلی ماہرین سے رجوع کرتے ہیں۔ جگہ جگہ عامل بابا کے اشتہار اور دکانیں شاہد ہیں کہ کاروبار اچھا چل رہا ہے۔

قدیم مصر میں جادو کا بہت زور تھا، وہ نظر بندی میں ماہر تھے۔ فرعون کے دربار میں جب جادوگروں نے رسیاں پھینکیں تو رسیاں مجمع کو سانپوں کی شکل میں نظر آئیں۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حکم سے عصا پھینکا تو عصا اژدھا بن کر سارے سانپوں کو نگل گیا۔

جادوگروں کا علم استدراج پر مبنی تھا جب کہ حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے معجزہ سے نوازا تھا۔ معجزہ نے بتایا کہ استدراج کا علم وقتی ہے جب کہ معجزہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک صاحبِ تصرف چاہتا ہے۔

بابلی روایات کے مطابق دیوتاؤں کو جادوئی صلاحیت حاصل ہے جس کے تحت وہ نظام کائنات چلاتے ہیں۔

جادو سفلی عمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سخت ناپسند فرمایا ہے۔ جادو وہ عمل ہے جس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نظام حق پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جادو کرنے والوں کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کا حکم دیا ہے۔

''کہو کہ میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے پروردگار کی۔ ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔ اور رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے۔ اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے۔ اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔'' (الفلق: ۱۔۵)

سفلی علوم کے ماہر ہڈیوں، بالوں اور سوئیوں کے علاوہ غلیظ چیزوں پر عملیات کرتے ہیں۔ جادو کرنے والے اور ان پر یقین رکھنے والوں کے لئے دنیا و آخرت میں خسارہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

''جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا جادو ہے۔ موسیٰؑ نے کہا، تم حق کو جادو کہتے ہو جب کہ وہ تمہارے سامنے آ گیا، کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر فلاح نہیں پاتے۔'' (یونس: ۷۶۔۷۷)

(قسط:۱)

شاہدہ خان

بے سکونی کی وجہ

خوشی آسائشوں سے نہیں ملتی۔ آدمی کی دوا آدمی ہے۔ اور یہ دوا بھی اس وقت تک کارگر رہتی ہے جب دو افراد کا ایک دوسرے سے تعلق اللہ کے لئے ہو۔

آدمی حیوانات سے اس لئے ممتاز ہے کہ وہ اچھائی اور برائی میں تمیز کرسکتا ہے، اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے اور اچھائی ظاہر کرتا ہے۔ ہم روزمرہ معمولات میں بیش تر کام معاشرہ میں اپنے اچھے ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے کرتے ہیں۔ خواتین صبح کے ناشتہ کی تیاری، بچوں کے اسکول اور شوہر کے آفس جانے کے بعد گھریلو ذمہ داریاں باقاعدہ فکرمندی کے ساتھ اچھی معاشرتی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے انجام دیتی ہیں۔ اسی طرح مرد حضرات آفس اور کاروباری معاملات کی ذمہ داری ایک ذمہ دار کفیل کی حیثیت سے نبھاتے ہیں۔ خواتین اور مرد دونوں یہ معمول غیر محسوس اور روایتی انداز میں ایک نسل سے دوسری اور تیسری نسل کو منتقل کرتے چلے آرہے ہیں۔

بلاشبہ یہ روایات اعلیٰ اور بہترین معاشرہ کے لئے خوش آئند ہیں لیکن اس رویہ پر دوسرے زاویہ سے غور کریں تو فکر طلب حقائق آشکار ہوتے ہیں۔

گھریلو خاتون سے پوچھا جائے کہ آپ پابندی سے ناشتہ کی تیاری، بچوں کو باقاعدگی سے اسکول بھیجنے، شوہر کا خیال رکھنے اور گھر کے کام فکرمندی سے کیوں کرتی ہیں۔ سادہ جواب یہ ہوگا کہ محبت کا رشتہ ہے پھر ہمارے والدین نے تربیت اس طرح کی ہے۔ اگر میں اس روایت کو نہیں اپناؤں تو لوگ مجھے لاپروا اور غیر ذمہ دار سمجھیں گے، بچے اور گھر کے دیگر افراد میرے بارے میں کیا سوچیں گے—؟

جواب پر غور کیا جائے تو ذمہ داری پوری کرنے کی ایک وجہ لوگوں کی نظر میں اپنے اچھے ہونے کی حیثیت برقرار رکھنا ہے۔ یعنی تمام تر اچھے اعمال کا ایک مقصد ''لوگوں کی نظر میں'' اچھا بننا ہے۔ اس اچھائی پر کسی بھی طرح کے الزامات اور سوالات کا ''خوف'' انہیں فکرمند رکھتا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواتین کی اکثریت خود کو اچھا اور ذمہ دار ثابت کرنے کے لئے خوف کے سائے میں شب و روز گزار کر اپنی نسل کو بھی اس طرح زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہیں۔ ذمہ داری کی ادائیگی ہمارا

موضوع نہیں، موضوع وہ ''سوچ'' ہے جس کے تحت ذمہ داری ادا کی جارہی ہے۔

دوسری طرف مرد باقاعدگی سے کام پر جاتے ہیں، معاش کے حصول میں خوف اور مستقبل کے اندیشوں کی ڈرائیونگ فورس کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ وہ نوکری ختم ہوجانے اور کاروباری نقصان کے اندیشوں کے خوف کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ ذہن میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کل کو بچے کہیں کہ ابو نے ہمارے لئے کچھ نہیں کیا۔

مجموعی طور پر معاشرہ کے ان دونوں یونٹ کا مقصد خوشی کو حاصل کرنا اور غم سے دور رہنا ہے۔ بیش تر تجربہ کار اور عمر رسیدہ لوگ اپنی نسل کو اس طرح تعلیم دیتے ہیں کہ اپنی ذمہ داری پوری کر کے زندگی گزارو گے تو لوگ اچھا کہیں گے۔ یوں زندگی کا مقصد لوگوں کی نظر میں اچھا بن کر رہنا ہوگیا ہے۔

ترقی پذیر ممالک کے افراد خوش حالی کو مقصد حیات بناتے ہوئے زندگی کا لائحہ عمل نسل در نسل ترتیب دیتے ہیں۔ لیکن معاشی طور پر خوش حالی کو مقصد حیات سمجھا جائے تو ترقی یافتہ ممالک میں آسائشوں اور خوش حالی کے باوجود بے سکونی، بے چینی اور اضطراب کی شرح زیادہ کیوں ہے—؟ ذہنی الجھن اور تنہائی کا شکار افراد خودکشی کی طرف کیوں مائل ہوجاتے ہیں جب کہ ان کے پاس آسائشیں ہیں—؟ بعض ممالک میں خودکشی کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے کہ آدمی زندگی سے بیزار ہوجائے اور مزید جینا نہ چاہتا ہو تو وہ خودکشی کا راستہ اختیار کرسکتا ہے۔

گزشتہ سال ایک آسٹریلوی محقق کی رضاکارانہ موت شہ سرخی بنی۔ وہ ماہر نباتات و ماحولیات تھا۔ اس نے درجنوں تحقیقی مطالعے جاری کئے۔ موت سے قبل اخباری نمائندوں کو انٹرویو میں کہا کہ،

''موت کا دن معین ہے لیکن موت منتخب کرنے کا اختیار آدمی کو ہونا چاہئے۔ میری صلاحیتیں کم ہوگئی ہیں اس لئے میں مزید جینا نہیں چاہتا۔ عمر کے اس حصہ میں پہنچ گیا ہوں کہ جہاں میں خوش نہیں ہوں۔ موت کو گلے لگانا غم کی بات نہیں، غم کی بات یہ ہے کہ میں ایسا کرنے سے رک جاؤں۔''

اس آسٹریلوی محقق کی عمر 104 سال تھی۔

یہ ایک ایسے شخص کا واقعہ ہے جس نے بھرپور زندگی گزاری مگر عمر کے آخری دور میں تنہائی اور بینائی کی کم زوری کے سبب وہ زندگی سے نالاں ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے وہ خودکشی کی کوشش کر چکا تھا لیکن کوشش کام یاب نہیں ہوئی۔ پھر آسٹریلیا میں خودکشی کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے اس نے سوئٹزرلینڈ کا رخ کیا۔ اس کے خاندان کے چند افراد اس کے ساتھ سوئٹزرلینڈ تک آئے اور موت کے وقت اس کے پاس تھے۔

خوشی آسائشوں سے نہیں ملتی۔ آدمی کی دوا آدمی ہے۔

اور یہ دوا اس وقت تک کارگر رہتی ہے جب دو افراد کا ایک دوسرے سے تعلق اللہ کے لئے ہو۔

واضح ہوتا ہے کہ آسائش اور لوگوں کی نظر میں مقام سے سچی خوشی نہیں ملتی ـــ خوف بیدار ہوتا ہے۔

ہم خوش حالی کے حصول کے لئے مذہب کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اللہ سے دعا کیا مانگتے ہیں؟ یا اللہ! ہمیں پیسہ اور آسائشیں عطا فرما۔ یعنی ہم عبادت میں بھی ذہنی پیچیدگی کا شکار ہیں۔ عبادت کا جو مقصد ہے، عبادت اس مقصد کے تحت نہیں کی جارہی۔ یقیناً سچی خوشی اللہ تعالیٰ کی عبادت سے حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ عبادت جس کے باطن سے آدمی واقف ہو اور جو خالصتاً اللہ سے قرب کے لئے کی جائے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ اور امام ابو حامد الغزالیؒ کی سوانح حیات پر نظر ڈالیں تو عبادت وعلم کے سبب لوگوں میں ان کا مرتبہ تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دونوں اکابرین معاشرہ میں دیئے گئے مرتبہ کو نظر انداز کر کے سکون کی تلاش میں نکلے۔ مولانا روم کو حضرت شمس تبریزؒ ملے اور امام غزالیؒ کو حضرت ابوبکر شبلیؒ کی صورت میں راہ نما ملا۔ اس طرح دونوں عبادت کی باطنی حقیقت سے واقف ہوئے اور حقیقی سکون پایا۔

تلاش کرنا ہوگا کہ ہماری بے سکونی کی وجہ کیا ہے؟ خوش حال زندگی کے لئے اپنی کوشش پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ ہم ناخوشی سے دور رہنا چاہتے ہیں اور خوشی کے چھن جانے کے خوف میں مبتلا ہیں۔

زمین پر بابا آدمؑ اور اماں حواؑ نے پہلا دن گزارا تو زمین پر جن وسائل اور ماحول سے ان کا سامنا ہوا وہ سب تغیر کا مظہر تھے۔ انہوں نے زمین کی ہر شے اور عمل میں تغیر دیکھا۔ تغیر کی بنیاد شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے کی وجہ سے شک غالب ہونا تھا۔ دونوں کے لئے زمینی جسم کو توانا رکھنے کے لئے یہاں کے وسائل کو استعمال کرنا ناگزیر تھا۔ انہوں نے وسائل استعمال کئے مگر اس طرز فکر کے ساتھ کہ یہاں موجود ہر شے اللہ کی ملکیت ہے اور یہاں موجود ہر شے مفروضہ ہے۔ نہ کوئی شے ہماری ذاتی ملکیت ہے اور نہ ہمیں یہاں دل لگانا ہے۔ ہمارا زمین پر آنا نافرمانی کے سبب ہے اور اب اللہ کا فرماں بردار بن کر ہمیں اللہ کی قربت حاصل کرنی ہے۔

جنت کی زندگی کیا ہے ـــ؟ اللہ نے فرمایا،

''اے آدم! تم اور تمہاری زوج جنت میں رہو، اور جہاں سے جی چاہے خوش ہو کر کھاؤ پیو۔''

(البقرۃ:۳۵)

جنت میں حضرت آدمؑ کو جن وسائل کے استعمال کا اختیار دیا گیا ان میں درج ذیل نکات اہم ہیں،

۱۔ کھانا پینا (کھانے پینے کے وسائل کی موجودگی)

۲۔ جہاں سے (جگہ، زمین یا اسپیس کی موجودگی جس میں حدود کی قید نہیں ہے)

۳۔تم اور تمہاری زوج (خاندان)

۴۔خوش رہنا (خوف،غم اور شک سے دوری)

غور کیا جائے تو یہ سہولیات زمین پر بھی مطلوب ہیں یعنی رہنے کے لئے گھر، کھانا پینا، رشتے اور تعلقات۔ بابا آدمؑ اور اماں حواؑ نے جنت میں تمام وسائل اس طرز فکر کے ساتھ استعمال کئے کہ ساری جنت خالق کائنات اللہ کی ملکیت ہے، یہاں لامحدود اسپیس کو استعمال کرنے کے لئے خوش رہنا شرط ہے۔دوسری طرف زمین پر یہ تمام وسائل اور مظاہر محض طرز فکر کی انفرادیت کے باعث تغیر کی شکل اختیار کر گئے۔

نوع آدم کے پہلے فرد نے زمین پر ان وسائل کا استعمال اس بات کو مدنظر رکھ کر کیا کہ جنت میں واپسی کا راستہ ہموار ہو۔اس کی ناخوشی کا باعث ناآسودہ اور غیر آسائشی ماحول نہیں تھا بلکہ وہ زندگی اور وہ وطن تھا جو غلطی کی پاداش میں پردہ میں چلا گیا۔

ہم جانتے ہیں کہ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔لیکن یقین کیجئے، وہ ہمیں نہیں، اپنے ذہن کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں۔ مان لیا کہ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں، ہمیں ان کی نظر میں اچھا بننا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا اللہ ہمیں نہیں دیکھ رہا؟ اس بات کا خیال کیوں نہیں آتا؟

''وہی اول ہے اور آخر بھی، اور ظاہر ہے اور باطن بھی۔اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ جو کام بھی تم کرتے ہو، اللہ دیکھ رہا ہے۔'' (الحدید: ۳۔۴)

جب ذمہ داری ہر حال میں انجام دینی ہے پھر غیر متغیر ہستی جس نے ہمیں تخلیق کیا ہے، اس کا خیال دل پر غالب کیوں نہ ہو!

آیئے تھوڑی دیر کے لئے مراقبہ کریں کہ ہم اس دنیا میں اپنے جد امجد بابا آدمؑ اور اماں حواؑ کی طرح ہیں اور ہمیں یہاں رہتے ہوئے اپنے وطن جنت میں واپسی کا راستہ تلاش کرنا ہے۔نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم موجود ہے لیکن اس کو تن درست و توانا رکھنے کے لئے زمین پر وسائل کا استعمال اعتدال کے ساتھ کیا جائے گا تاکہ جسم کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور ہم مقصد حیات حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہیں۔اس طرز فکر سے تغیر والا ذہن مغلوب ہوتا ہے، ظاہری خدوخال سے وابستگی کم ہوتی ہے، چپک کا عنصر نظر انداز ہو جاتا ہے اور قدم غیر متغیر نظام کی جانب اٹھتے ہیں۔

ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے، دوست احباب تمام رشتے اللہ کی مشیت ہیں۔ان سے اس وجہ سے محبت نہ کریں کہ ہم ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے بلکہ ان سب سے محبت اور تعلق اس لئے قائم رکھا جائے کہ یہ سارے رشتے اللہ کی نعمت ہیں اور اللہ نے ہمیں عطا

فرمائے ہیں۔فکر کا زاویہ بدلنے سے اولاد ہمارے لئے فتنہ کے بجائے شکر گزاری اور نعمت بن جائے گی۔

گھر، سواری اور مال سب اللہ کی دی ہوئی زمین پر اللہ کی عطا کردہ نعمتیں ہیں جو خالصتاً اللہ کی ملکیت ہیں۔ اللہ نے ہمیں ان پر تصرف کا اختیار دیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہرگز ان نعمتوں کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں۔ مہمان بن کر آئے ہیں، مہمان کی طرح میزبان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وقت گزاریں کہ ایک روز یہاں سے جانا ہے۔اس سے ذہن کی اسپیس پر موجود تغیراتی پرتوں کی گرد صاف ہوگی۔

تغیر کا پہلا رخ غیر متغیر ہے اور سب کے اندر موجود ہے۔ہمیں شے کے استعمال سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ اس شے کا ہم سے براہ راست تعلق نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق اللہ سے ہے اور اللہ نے یہ شے ہمیں دی ہے۔

زندگی گزارنے کے آداب یہ ہیں کہ صبح بیدار ہوتے ہی اللہ کے حضور عرض کریں کہ اے رب العالمین! ہم آپ سے توفیق چاہتے ہیں کہ آج کا دن تغیر میں الجھے بغیر گزرے اور ہم پر ہر شے کی حقیقت واضح ہو۔

خواتین نیند کی قربانی دے کر صبح سویرے اٹھتی ہیں اور گھریلو ذمہ داری نبھاتی ہیں۔اگر وہ صبح کا آغاز قرآن کریم میں غور وفکر سے کریں تو دن بھر قرآنی آیات کی ذہن میں گردش ہوگی، مفہوم منکشف ہوگا اور قلبی سکون حاصل ہوگا۔

نیند سے جاگتے وقت ذہن یک سو اور گزرے ہوئے دن کے ریکارڈ سے بہت حد تک خالی ہوتا ہے۔ایسے وقت میں تفکر بلندیوں تک پرواز کرتا ہے اور وہ رموز آشکار ہوتے ہیں جن سے زندگی کے غیر متغیر رخ کا عرفان ملتا ہے۔جو کام کریں، معاشرہ کے خوف سے نہیں، اللہ کی رضا کے لئے کریں — کام اور رشتوں میں برکت شامل ہوجائے گی۔

یہی اصول مردوں کے لئے ہے۔فجر کی نماز کے لئے اٹھیں اور قرآن کریم پر تفکر سے دن کا آغاز کریں۔ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، باس یا گاہک کے ہاتھ میں نہیں۔اللہ کو محنت اور دیانت داری پسند ہے۔ باس یا بزنس سے توقعات وابستہ کرنے والے لوگ خوف میں رہتے ہیں۔جو لوگ محنت کر کے اللہ پر توکل کرتے ہیں، ان کے لئے اللہ کا سہارا کافی ہے۔

بیان کئے گئے نکات بھاری محسوس ہوں تو سمجھ لیجئے تغیر پذیر زندگی گزارنے کی قدریں مستحکم ہوچکی ہیں۔ قدریں چوں کہ تغیر کی ہیں اور تغیر کی صفت میں تغیر ہے اس لئے جس روز ہم خود کو بدلنے کی کوشش کریں گے، یہ بدل جائیں گی۔

اللہ کی خوشی کے لئے زندگی بسر کرنا، بچوں کی تربیت سمیت تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور معاش کے لئے جدوجہد وہ طریقہ ہے جس کو اپنا کر بندہ صراط مستقیم پر گامزن ہوتا ہے۔

سرورق کی تشریح

ازل سے ابد تک ہر شے مقداروں پر قائم ہے اور ہر مقدار حرکت میں ہے۔ حرکت تھم جائے تو کائنات تھم جائے تو کائنات کا وجود زیر بحث نہیں آئے گا۔ عالم ارواح سے شے اس دنیا میں آتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد غیب ہو جاتی ہے۔ سرورق ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کی تفسیر ہے۔ ہر چیز اللہ کی طرف سے آکر وقت مقررہ کے بعد اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کائناتی پروگرام لوح محفوظ سے یکجا اور پیہم نزول کر کے لوح دوئم پر آتا ہے اور یہاں سے

انفرادی طور پر نشر ہوتا ہے۔ پروگرام میں ارادہ کو استعمال کرنے اور استعمال نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ آدمی ارادہ کو استعمال کر کے جزا یا سزا کا مستحق بنتا ہے۔ نوع آدم کا شرف ارادہ کو اللہ کے تابع کرنے میں ہے۔ اللہ کی چاہت کو زندگی بنانے سے روحانی مدارج طے ہوتے ہیں۔ روح کا تعلق عالم غیب سے ہے اور جسم مادی زون کے خمیر سے بنتا ہے۔ روح کی طرف متوجہ رہنے والا غیب کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، جسم کی نشوونما میں مشغول شخص ثقل میں دھنس جاتا ہے۔ چوں کہ غیب سے آنے والے کو واپس غیب میں جاتا ہے اس لئے وہ طرز عمل اختیار کرنا چاہئے جس سے شرمندگی نہ ہو۔

''ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہم تمہیں شر اور خیر سے آزماتے ہیں اور آخر کار تم سب ہماری ہی طرف لوٹ کر آنے والے ہو'' (الانبیآء:۳۵)

ہم ایک زون میں پیدا ہوتے ہیں پھر دوسرے میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وہاں کے تقاضوں کے مطابق لباس پہنتے ہیں۔ منتقلی پر ہمارا اختیار نہیں ہے لیکن قیام کے دوران اختیار کو استعمال نہ کرنے کا اختیار موجود ہے۔

مخلوقات موت وحیات کے عمل سے یکساں طور پر گزرتی ہیں۔ ہر سابق عالم ـــ موجودہ عالم کے مشابہ ہے۔ لباس کے فرق کی وجہ سے زندگی مختلف نظر آتی ہے لیکن زندگی ہر زون میں جاری ہے۔ موت ـــ زمان و مکان کے طویل لیکن مختصر سفر میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونے کا نام ہے۔ (یاسمین گل۔ فیصل آباد)

زندگی خیال کے تابع ہے۔ خیال لہر اور لہر حرکت ہے۔ حرکت نزول وصعود کے مراحل سے گزر کر نقطۂ آغاز پر آتی ہے اور دائرہ مکمل ہوتا ہے۔ سرورق میں جامنی رنگ کی جالی پر عالم لوح محفوظ لکھا ہوا ہے۔ یہ ورائے بے رنگی کا مقام ہے۔ لہریں اس مقام سے نزول کر کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں اور ہم ان رنگوں کو دنیا کہتے ہیں۔

سرورق کو دیکھ کر تاثر پیدا ہوا کہ بادل، ستارے اور عالمین سب تغیر کی نشان دہی ہیں۔ ابدال حق فرماتے ہیں،

''تغیر حرکت کا دوسرا نام ہے اور کسی شے میں جب تک حدود کا تعین موجود نہ ہو حرکت واقع نہیں ہو سکتی۔'' (لوح وقلم)

ذہن میں آیا کہ ہر مقام اسپیس ہے۔ جہاں اسپیس ہو وہاں حرکت یا تغیر ہوتا ہے اور تغیر محدودیت ہے۔

(ڈاکٹر زبیر احمد۔ کراچی)

حرکت کی لہریں دو طرز وں پر کام کرتی ہیں۔ صعودی حرکت غیب کی دنیا کا ادراک دیتی ہے جب کہ نزولی حرکت مادی دنیا کے حواس سے متعارف کراتی ہے۔ صعودی حواس میں آدمی ٹائم اینڈ اسپیس کی بندش کو محسوس نہیں کرتا۔ نزولی حرکت میں اسپیس غالب اور ٹائم مغلوب ہوتا ہے۔ لوح محفوظ میں حرکت کی مقداریں ریکارڈ ہیں۔ ریکارڈ جب زمین کی اسکرین پر منعکس ہوتا ہے تو روح حرکت کے لئے میڈیم بن جاتی ہے۔ اسپیس کی مناسبت سے حرکت اصل سے دور ہوتی ہے۔ جب اسپیس سمٹتی ہے تو حرکت اپنے مرکز کے قریب ہو جاتی ہے۔

مرشد ـــ مرید کے ذہن کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کر کے ایک نقطہ پر لے کر آتا ہے تا کہ ذہن کثرت سے نکل کر وحدت میں مرکوز ہو۔ نظر اس نقطہ میں تجلی کے عکس کا مشاہدہ کر کے مرید کا یقین بن جاتی ہے۔ یقین ـــ ایمان ہے۔ (پروفیسر محمد طاہر۔ چنیوٹ)

''وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔'' (البقرۃ: ۱۵۶)

آیت میں حرکت کے دو رخوں کا بیان ہے جن پر زندگی مقداروں کے ساتھ قائم ہے۔

۱۔ اللہ کی طرف سے آنا ــــ نزولی حرکت

۲۔ اللہ کی طرف لوٹنا ــــ صعودی حرکت

مارچ 2019ء کے سرورق پر نزولی اور صعودی حرکت کا خاکہ پیش کر کے قاری کو ان مراحل کے درمیان عالمین کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ کائناتی پروگرام کا آغاز ''کُن'' سے ہوا۔ ارواح ظاہر ہوئیں۔ ارواح کی تمثیلات کو نشر کرنے کے لئے میڈیم بنایا گیا جس کو ''لوح محفوظ'' کہتے ہیں۔ لوح محفوظ پر نوعوں کا انفرادی اور اجتماعی پروگرام موجود ہے۔ پروگرام میں زندگی گزارنے کے تقاضے اور تقاضوں کی تکمیل کے لئے وسائل تمثیلات میں ریکارڈ ہیں۔ مثلاً پیاس کا تقاضا ہر نوع میں ہے، تقاضے کی تکمیل کے لئے بارش، چشمہ، ندی، دریا اور سمندر اسباب ہیں۔

عالم ناسوت میں آنے سے پہلے فرد معین وقت برزخ میں گزارتا ہے۔ برزخ کے معنی پردہ کے ہیں جس کا کردار دونوں عالمین میں gateway کا ہے۔ برزخ اور ناسوت دونوں اسکرین ہیں جن پر لوح محفوظ سے پروگرام نشر ہوتا ہے۔ چوں کہ نوع آدم کو اختیار دیا گیا ہے اس لئے اسکرین پر ظاہر ہونے کے بعد اعمال کی فلم اگلے عالم میں منتقل ہوتی ہے، اسے ''کتاب المرقوم'' کہتے ہیں۔

برزخ اور اعراف دونوں میں خدوخال روشنی کی بساط پر قائم ہیں۔ عالم اعراف کے اپنے تقاضے ہیں، وہاں ٹائم اور اسپیس کی رفتار وہ نہیں ہے جو اس دنیا میں ہے۔ سمجھنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعراف میں حواس کی رفتار ناسوتی دنیا میں حواس کی رفتار سے 60 ہزار گنا بڑھ جاتی ہے۔ اعراف کے بعد مزید عالمین ہیں، پھر ابد ہے، اس کے بعد ابدالآباد ہے۔ سفر جہاں سے شروع ہوا، وہیں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ (مرسلین احمد۔ اسلام آباد)

گھٹنا + بڑھنا = فنا

تخلیق دراصل علم شے ہے۔ جب تک کسی شے کا علم نہیں ہوگا شے وجود میں نہیں آئے گی۔ کائنات دراصل اللہ کا ذاتی علم ہے۔ کائنات اور کائنات کے تمام اجزائے ترکیبی پہلے سے اللہ کے ذہن میں موجود تھے۔ اللہ کے ذہن میں کائنات کی موجودگی ہی اللہ کا علم ہے۔ کلیہ یہ بنا کہ کائنات سے پہلے علم ہے پھر شے ہے۔ علم چوں کہ براہ راست اللہ کا ذاتی علم ہے اس لئے اللہ کی طرح اس علم کو بھی بقائے دوام حاصل ہے۔ شے چوں کہ علم کے بعد کی مظاہراتی شکل ہے اس لئے اس کو بقا نہیں ہے۔ شے کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شے کسی ایک نقطہ یا مرکز کے ساتھ وابستہ ہے۔ شے کی تخلیق میں یہ بات مخفی ہے کہ ہر شے ہر آن گھٹتی ہے اور ہر آن بڑھتی ہے۔ گھٹنے اور بڑھنے کا یہ عمل بالآخر فنا ہے۔ (نظریۂ رنگ و نور)

نیرّ اعظم

گوری کرت سنگھار

سولہ سنگھار برصغیر پاک و ہند میں خواتین کی آرائش کے سولہ کلاسیکی طریقے ہیں جو ماضی میں کم وبیش ہر طبقہ کی خواتین شادی سے پہلے اپنی لڑکیوں کو سکھاتی تھیں۔ سولہ سنگھار کے آغاز کے حوالہ سے حتمی رائے موجود نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر میں ان کی ابتدا تہذیب کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔

سنگھار کا شوق مرد و خواتین دونوں کو ہے اور دونوں زمانہ کی روایات کے مطابق شوق کی تسکین کرتے ہیں۔ زیورات سے سنگھار ہو یا نقوش کو میک اپ سے نمایاں کیا جائے، دونوں کا تعلق رنگوں سے ہے۔ رنگوں میں تناسب خوب صورتی ہے۔

آدمی ابتدا سے کوشش میں رہا ہے کہ وہ خوب صورت نظر آئے، ساخت اور خدوخال پُرکشش ہوں۔ کشش سب میں موجود ہے مگر نمایاں کرنے کے فن میں ہر کوئی ماہر نہیں۔ صرف رنگوں کو تھوپ لینے سے کشش ظاہر نہیں ہوتی، رنگوں کی مقدار میں توازن ضروری ہے۔

ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب مرد زیبائش و آرائش میں پیش پیش تھے اور خواتین اس شعبہ میں ان سے پیچھے تھیں۔ دور بدلا اور رنگ بدل گئے۔ البتہ جس دور میں مردوں کی اس شعبہ میں اجارہ داری تھی، اس کا ایک احوال مغربی مصنف ول ڈیورنٹ کی کتاب ''دا اسٹوری آف سیویلائزیشن'' میں ہے۔ ترجمہ:

''فطری مناظر کے قریب رہنے والے لوگوں میں عورت کے بجائے مرد زیور پہنتا تھا۔ وہ جانوروں کو بھی زیور پہناتے تھے۔ بونوک کہتا ہے کہ 'آسٹریلیا میں زیبائش پر مکمل طور پر مرد کی اجارہ داری ہے۔' اسی طرح مینیسیا، نیو گیاتا، نیو کیلیڈونیا، نیو برٹن، نیو بینوور اور شمالی امریکی انڈینز میں بھی زیبائش پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ بعض قبائل میں جتنا وقت جسم کی زیبائش پر صرف ہوتا، کسی اور کام پر صرف نہیں کیا جاتا تھا۔ جسم کو رنگنا آرٹ کی پہلی شکل ہے۔ مردوں کا خود کو رنگنے کا ایک مقصد عورتوں کی توجہ حاصل کرنا اور بعض اوقات دشمنوں کو خوف زدہ کرنا ہوتا۔ آسٹریلوی باشندے سفید، سرخ اور زرد رنگ کا روغن ساتھ لئے پھرتے تاکہ زیادہ سے زیادہ حسن کو سنواریں۔ جب یہ اشیا ختم ہو جاتیں تو وہ دور دراز کی مہم جوئی اور خطرات کی پروا نہ کرتے ہوئے رنگوں کی تلاش میں نکلتے۔ روزمرہ زندگی میں گالوں، کندھوں اور سینہ پر رنگ لگانا معمول تھا لیکن تہوار

کے ایام میں اگر پورے جسم پر رنگ نہ کیا گیا ہوتا تو یہ ان کے لئے سخت شرمندگی کا باعث ہوتا۔''

مرد وعورت میں زیبائش و آرائش کی خواہش بیدار ہوئی تو اسے پورا کرنے کے لئے کیمیا کا سہارا لیا گیا۔ قدرتی اشیا سے مختلف مرکبات بنائے گئے جن میں وقت کے ساتھ جدت پیدا ہوتی رہی۔ ذہن نشین رہے کہ خوب صورتی فیشن ہے جو ثقافت اور مذہبی روایات کے مطابق وقت کے ساتھ بدلتا ہے۔ حسن و آرائش کا جو اہتمام ماضی میں ہوتا تھا، آج کیا جائے تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں جب کہ اس زمانہ میں یہ فیشن مقبول تھا۔

تقریباً ہر تہذیب میں آرائش کے لئے مصنوعات کے آثار ملتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ لپ اسٹک پانچ ہزار سال قبل سمیری باشندوں نے ایجاد کی۔ ان کے مرد و عورت دونوں لپ اسٹک لگاتے تھے۔ سمیری، آشوری اور بابل کے لوگ چہرہ پر میل اور گرد صاف کرنے کے لئے شہد، مٹی اور جو کے آٹے کے علاوہ روغن بید انجیر (کاسٹر آئل)، سونف کا عرق ، دارچینی ، الائچی، myrrh (لوبان کی طرح کی خوش بو دار گوند) اور سرسوں وغیرہ کا مخصوص طریقہ سے استعمال کرتے۔

مصری کریموں اور تیل کے ذریعے صحرا کی تپتی ہوا سے جلد کو محفوظ رکھتے۔ کریموں کے بنیادی اجزا میں بابونہ، سوسن، پودینہ، اکلیل کوہستانی (rosemary)، دیودار، گلاب اور گھیکوار ـــ تیل میں زیتون، تل اور بادام ـــ اور وہ پودے جن سے خوش بویات بنائی جاتی ہیں، استعمال ہوتے تھے۔ اس دور کے مجسموں اور تصاویر سے ظاہر ہے کہ بااثر طبقات میں کاجل لگانے کا رواج عام تھا۔ اسی طرح رومیوں نے سنگھار میں پھولوں کے عرق کو شامل کیا۔

موجودہ دور میں زیبائش و آرائش کے طریقۂ کار اور مصنوعات کا تانا بانا مسلمان محقق ابو القاسم الزہراوی الانصاری (1013-936ء) سے ملتا ہے۔ وہ کیمیا، طبیعیات اور سرجری کا ماہر تھا۔ الزہراوی کو آلات جراحی کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے طب پر ''کتاب التصریف'' لکھی جو بہت معروف ہوئی۔ اس کی 30 جلدیں ہیں، انیسویں جلد کا سمیٹکس سے متعلق ہے۔ انسائیکلو پیڈیا ''التصریف'' یورپ کی جامعات میں بارہویں سے سترہویں صدی تک بنیادی نصاب میں شامل تھا۔ انیسویں جلد کا عنوان '' ادویات الزینت'' (medicine of beauty) ہے جس میں الزہراوی نے بالوں کی حفاظت، جلد اور جسم کی خوب صورتی کے طریقے بیان کرنے کے ساتھ موجودہ دور کے مماثل ڈیوڈرنٹ اور مختلف ساخت میں پیک پرفیوم کی تفصیل دی ہے۔ الزہراوی نے بتایا کپڑوں میں مہک یا خوش بو رکھی جائے تو وہ مہک کو جذب کر لیتے ہیں اور خوش گوار تاثر پیدا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کاسمیٹکس طب کی شاخ ہے۔ طبی استعمال کے لئے دوسری

کاسمیٹکس کے ساتھ نیزل اسپرے، ماؤتھ واش اور ہاتھوں کی کریم متعارف کروائیں۔ مرگی کے جھٹکوں کے لئے غوالی* اور لفائف*، سردی سے آرام کے لئے مشک، کافور اور شہد کے بارے میں لکھا۔ موجودہ صدی میں کاسمیٹکس کے شعبہ میں ترقی الزہراوی کی تحقیق اور ایجادات کی مرہون منت ہے۔

روایتی سنگھار زیورات کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ زیورات ایک زمانہ میں قید کی علامت تھے جو غیر محسوس طریقہ سے فیشن بن گئے۔ مرد و عورت میں سنگھار کے رجحان کے بارے میں کتاب ''دا اسٹوری آف سیویلائزیشن'' میں لکھا ہے،

''تمدن کے عناصر میں زیور سب سے قدیم ہے۔ مرد و عورت زمانہ قدیم سے لباس سے زیادہ زیورات کو ترجیح دیتے تھے۔ غیر متمدن لوگوں کی تجارت زیبائش اور کھانے پینے کی اشیا تک محدود تھیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کو قبروں میں ہزاروں سال پرانے زیورات کے ٹکڑے اور دانتوں کے بنے ہوئے ہار ملے ہیں۔ زیبائش و آرائش کا آغاز ابتدا میں سادگی سے ہوا لیکن ان میں تیزی سے جدت پیدا ہوئی اور یہ اقوام کی ضرورت بن گئی۔ کہتے ہیں کہ گالا خواتین وزنی بالیاں پہنتی تھیں۔ بعض ڈنگا عورتیں بھاری زیورات سے لدی ہوتی تھیں۔ ایک افریقی حسینہ تانبے کی بالیاں پہنتی تھی جو دھوپ میں گرم ہو جاتیں۔ اس نے ملازم رکھا تھا جو اس پر سایہ کرتا یا پنکھا جلتا۔ وابونیاس کی ملکہ پیتل کا کالر لٹکائے رکھتی۔ جن غریب عورتوں کے پاس ہلکا زیور ہوتا وہ خواص کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتیں۔ خواص کے زیورات وزنی ہوتے تھے۔''

سنگھار کی تفصیل سولہ سنگھار کے بغیر ادھوری ہے۔ یہ اصطلاح خاص و عام میں مقبول ہے لیکن اس کے تاریخی پس منظر سے لوگ ناواقف ہیں۔

سولہ سنگھار برصغیر پاک و ہند میں خواتین کی زیبائش و آرائش کے سولہ کلاسیکی طریقے ہیں جو ماضی میں کم و بیش ہر طبقہ کی خواتین شادی سے پہلے اپنی لڑکیوں کو سکھاتی تھیں۔ سنگھار کے سولہ طریقے کب متعین ہوئے اس حوالہ سے حتمی رائے موجود نہیں تاہم سولہ سنگھار کے آثار ماضی کی جن تہذیبوں میں ملتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں ان کی ابتدا تہذیب کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔ گندھارا، آریائی اور قدیم دراوڑی دور کی ثقافت میں جگہ جگہ آثار نظر آتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ سولہ سنگھار کی روایت زندگی کا حصہ بن گئی۔ خواص سے یہ رجحان عوام میں منتقل ہوا اور پنجاب، دکن، سندھ سمیت دیگر علاقوں میں ہر طبقہ اور مذہب کی خواتین نے اپنایا۔ آج بھی روایت پسند خاندانوں میں سولہ سنگھار کے طریقے رائج ہیں۔

سولہ سنگھار میں زیورات اور چہرہ پر لگانے والی چیزیں شامل ہیں۔ خواتین مذہبی اور سماجی تہواروں میں سنگھار کے لئے سولہ اشیا استعمال کرتیں اور زیبائش

کے لئے سولہ مراحل سے گزرتیں۔

زیبائش کے سولہ اجزا یہ ہیں:

۱۔ ٹیکا	۲۔ سیندور کی دھار
۳۔ بندیا	۴۔ کاجل
۵۔ جھمکا یا بالی	۶۔ نتھ
۷۔ چوڑیاں	۸۔ انگوٹھی
۹۔ مہندی	۱۰۔ کمر بند
۱۱۔ بازو بند	۱۲۔ عطر یا خوش بو
۱۳۔ گجرا	۱۴۔ پائل یا پازیب
۱۵۔ پیر کی انگوٹھی	۱۶۔ ہار

آریائی ادب میں سنگھار کے سولہ مراحل یہ ہیں:

۱۔ میردانہ: پہلے مرحلہ میں خوش بودار تیل سے مساج کیا جاتا ہے۔

۲۔ منگل سنانم: تازہ پانی سے نہانا دوسرا مرحلہ ہے۔ دودھ، روغن بادام، گلاب کی پتیاں، خس*، مرواہ* اور لودھرا* کو پانی میں مخصوص ترکیب سے ملا کر بطور صابن استعمال کیا جاتا تھا۔

۳۔ کیس پاش سگندھی کرنم: بالوں میں تیل لگا کر سیکا کائی کی لئی، ناگر موتھ یا کچور کے لیپ کے بعد بال ریٹھے سے دھوئے جاتے۔

۴۔ انگراگ ولیپن: اس مرحلہ میں چہرہ، گردن، شانوں اور بازوؤں پر صندل کے باریک سفوف کا لیپ کر کے صندل کو بطور فاؤنڈیشن استعمال کیا جاتا۔

۵۔ کاجل ریکھا دیپن: کاجل یا سرمہ سے آنکھوں میں دھاریاں کھینچی جاتیں۔

۶۔ تلک پرسادھن: ماتھے پر سرخ سیندور یا طلائی نشان سے بندیا بنائی جاتی۔

۷۔ مکھ پرسادھن: نظر بد سے محفوظ رہنے کے لئے جڑی بوٹیوں سے کشید کئے گئے رنگ، سونے، چاندی اور قیمتی موتیوں سے بنے جڑاؤ نشان چہرہ پر منقش انداز میں بنائے جاتے۔

۸۔ کیس پاش رچنا: بالوں کو جوڑے یا مختلف طریقہ سے ترتیب دیا جاتا۔

۹۔ الکت پش رچنا: سرخی سے ہونٹ رنگنا۔

۱۰۔ ہست سوشوبھیتم: ہاتھوں کو صفائی کے بعد زیورات اور حنا سے سنوارا جاتا۔ ہاتھوں کی صفائی کے

عمل کو موجودہ دور میں ''مینی کیور'' کہتے ہیں۔

۱۱۔ پادسوشوبھیتم: پیروں کو صاف کر کے مہندی لگاتے۔ پیر کی انگلیوں میں انگوٹھی پہنی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں پیروں کی صفائی کو ''پیڈی کیور'' کہتے ہیں۔

۱۲۔ مہاوستراپریدھنم: تہوار کی مناسبت سے لباس زیب تن کیا جاتا۔

۱۳۔ پوشپ دھرنم: چنبیلی یا موتیے کے گجرے جُوڑے، گردن اور کلائی پر پہنے جاتے۔

۱۴۔ النکار دھرنم: اس مرحلہ میں طلائی، سیمیں اور دیگر زیورات سے خود کو آراستہ کیا جاتا۔

۱۵۔ تمبل سیونم: سانس میں تازگی، منہ اور دانت کو خوش گوار احساس دینے کے لئے پان، مساگ، الائچی یا تمبولم چبایا جاتا۔

۱۶۔ درپن وکولن: سنگھار کے آخری مرحلہ میں آئینہ کے سامنے تمام مراحل کا ازسرنو جائزہ لے کر خامیاں دور کی جاتیں۔

یہ خواتین کے سولہ سنگھار کا پس منظر ہے۔

سولہ سنگھار نے ادب و سخن کو بھی گرویدہ بنایا۔ سنسکرت سے لے کر موجودہ دور کے ادب میں اس کا تذکرہ ہے۔ پروین شاکر نے سنگھار کے مختلف اجزا کو ایک آزاد نظم میں موتی کی طرح پرویا ہے۔

بال بال موتی چمکائے
روم روم مہکار
مانگ سیندور کی سندرتا سے
چمکے چندن* وار
جوڑے میں جوہی* کی بینی
بانہہ میں ہار سنگھار
کان میں جگ مگ بالی پتّا*
گلے میں جگنو ہار
صندل ایسی پیشانی پر
بندیا لائی بہار
سبز کٹارا* سی آنکھوں میں
کجرے* کی دو دھار
گالوں کی سرخی میں جھلکے
ہردے* کا اقرار
ہونٹ پہ کچھ پھولوں کی لالی
کچھ ساجن کے کار
کسا ہوا کیسری* شلوکا*
چنری دھاری دھار
ہاتھوں کی اک اک چوڑی میں
موہن کی جھنکار
سہج چلے، پھر بھی پائل میں
بولے پی کا پیار
اپنا آپ درپن میں دیکھے
اور شرمائے نار*
نار کے روپ کو انگ لگائے
دھڑک رہا سنسار
گوری کرت سنگھار
گوری کرت سنگھار

نثر اور نظم دونوں میں سنگھار کے ذکر کے بغیر محبوب کے حسن کی تعریف ادھوری لگتی ہے۔شاعر میاں محمد بخش کی مشہور مثنوی ''سیف الملوک'' میں متعدد مقامات پر حسن وسنگھار کا ذکر ہے۔

اکھین تیز کٹار فولادی آہیاں وچ میاناں
سرخ میان بناتی ملیا سیون وچ نشاناں
چن دوکھن دونویں رخسارے بندی نال سنگارے
بندی بندی پھبدی آہی وانگ زحل ستارے
سوہے ہوٹھ یاقوت کھرے تھیں کاریگر سنوارے
دند لباں وچ کجّے آہے وچ شفق جیون تاری
چاندی وانگر رنگ جثّے دا ہوٹھ مٹھے کھنڈ مصری
مصری سوہنے اس ول تک کے حسن مصر دا وسری
پمنی کانی زہروں پانی ترکھے تیر خدنگدے
بسلے ناگ ایانے چوری نال دلاں نوں ڈنگدے

ترجمہ: محبوب کی آنکھیں میان میں موجود فولادی تیز چھری کی مانند ہے۔آنکھوں میں سرمہ کی سلائی ایسے جیسے سرخ میان۔رخسار چاند کے دوٹکڑے ہوں، بندی لگا کر ان کی زیبائش کی گئی ہے۔ماتھے پر بندی ایسے چمکتی ہے جیسے زحل ستارہ ہوتا ہے۔اصلی یاقوت کی طرح سرخ ہونٹ کسی ماہر کاریگر نے سنوارے ہوں۔ ہونٹوں میں چھپے دانتوں کی مثال صبح وشام کی سرخی میں ستاروں کی ہے۔ چاندی کی طرح سفید بدن اور ہونٹ چینی اور مصری (نبات) سے شیریں۔مصر کے حسین اس کا حسن دیکھ کر حسن مصر کو بھول جائیں۔ گھائل کر دینے والی پلکیں خدنگ (مضبوط لکڑی) کے تیر کی طرح تھیں۔تیر نادان ناگ کی طرح چوری سے دلوں کو ڈس لیتے تھے۔''

بناؤ سنگھار نے بڑی صنعت کی صورت اختیار کر لی ہے جس سے لاکھوں افراد کا روزگار وابستہ ہے۔اس صنعت میں تنوع کی وجہ سے ہر تھوڑے دنوں بعد بازار میں نیا فارمولا متعارف ہو جاتا ہے۔

صرف یورپ میں کاسمیٹکس مصنوعات کی مارکیٹ 70 ارب یورو سے زائد ہے۔علاوہ ازیں اس صنعت کے دوام کے لئے باقاعدہ تحقیق کا شعبہ ہے جو قدرتی اجزا سے جلد اور بالوں کی خوب صورتی کی مصنوعات بنانے کے لئے ان گنت اجزا پر تجربات کرتا ہے۔ پاکستان میں اس منڈی کی مالیت 150 ارب روپے سے زائد ہے۔

* لفائف (خوش بودار بخور) * غوالی (کافور، عنبر اور مشک کا مرکب) * خس (خوش بودار گھاس) * مرواہ (خوش بودار پودا) * لودھرا (ایک بوٹی جو رنگنے کے کام آتی ہے) * چندن (صندل) * جوہی (چنبیلی کی مانند پھول) * کجرا (کاجل) * پتّا (پتے کی شکل کا کان کا زیور) * کٹارا (خنجر کی شکل کا نشان) * ہردا (دل، قلب) * کیسری (زعفرانی، زرد) * شلوکا (وہ کرتا جس کی آستین کہنیوں تک اور لمبائی کمر تک ہو) * نار (عورت)

عائشہ خان

مرشد کی باتیں

ذہن پرندوں سے دوستی کے نکتہ پر ٹھہرنے کی وجہ سے کیفیت خواب میں منتقل ہوئی۔شعور کے اس پار لاشعور میں دیکھا کہ پرندے تخت کے بجائے مٹی پر بیٹھے ہیں، وہ پرندوں کے قریب گیا لیکن پرندے اڑے نہیں بلکہ مٹی پر قطار میں بے حس وحرکت ہو گئے جیسے انہوں نے خود کو نثار کر دیا ہو۔

بعض اوقات ذہن میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن الفاظ نہیں ہوتے۔الفاظ ڈائی مینشن ہیں اور ذہن میں موجود نکات ڈائی مینشن سے ماورا ہیں۔نکات پر مرکوز ہونے سے دباؤ پڑتا ہے، ذہن میں دباؤ برداشت کرنے کی سکت نہ ہو تو فوراً کسی اور شے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

چند روز مسلسل یہ کیفیت رہی۔لکھنے لکھانے سے تعلق ہو تو تعطل سے دماغ سن محسوس ہوتا ہے۔

دباؤ کا خول توڑنے کے لئے اس نے ذہن دباؤ پر مرکوز کر دیا، لاشعور سے جو کچھ شعور پر وارد ہوا، لکھنا شروع کیا۔پلکیں بوجھل ہو گئیں، آنکھیں جلنا شروع ہوئیں، دماغ پر منوں بوجھ محسوس ہوا، سر کو جھٹکے لگے لیکن وہ لکھتا رہا۔بوجھ سکت سے باہر ہوا تو بے حال ہو کر سر میز پر رکھ دیا، کچھ دیر تک آنکھیں بند کیں، یقین تھا کہ سو جاؤں گا لیکن انجانی قوت نے لہروں کی زبان میں پیغام دیا کہ دباؤ کے آگے جھکنا نہیں ہے — اس نے سر اٹھایا اور کھلتی بند آنکھوں سے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔تقریباً آدھا گھنٹا اس کیفیت میں رہنے کے بعد توجہ کاغذ پر کھلتی بند آنکھوں سے مرکوز ہو گئی اور مزاحمت کا خیال حذف ہو گیا۔

کچھ دیر بعد لکھتے لکھتے احساس ہوا کہ وزن بے وزن ہو گیا ہے اور نیند مغلوب ہو گئی ہے۔شعوری سکت دباؤ کے برابر ہوئی تو اس نے ایک گھنٹے میں تحریر لکھ لی جس کے لئے وہ کئی روز سے کوشاں تھا۔شام کے سات بجے تھے، لکھنے کے بعد حواس ایک بار پھر بوجھل ہونا شروع ہوئے، بدن میں ہمت نہیں رہی اور نیند نے آغوش میں لے لیا۔آنکھ کھلی تو صبح کے آٹھ بجے تھے۔

وجود پر خمار غالب تھا۔دن کا آغاز کر کے کام میں مشغول ہونے سے توجہ کام پر مبذول ہو گئی۔

مرشد کریم کو تحریر دکھائی اور احوال بتایا۔

انہوں نے پوچھا، تیرہ گھنٹے نیند — ؟

پھر خود فرمایا، سکت کم تھی۔عادت ہو جائے گی۔

تحریر پڑھ کر حکم دیا کہ اسے جلا دو۔

کاغذ جلانے کے بعد ایک لفظ یاد نہیں کہ کیا لکھا۔
مرشد کا حکم تھا، مرید نے تعمیل کی۔
مشق سے معلوم ہوا کہ اندر میں اتنی سکت بیدار ہوگئی ہے کہ شعور دباؤ کو قبول کرسکتا ہے۔

مرشد کریم سے پوچھا، بتایئے کیا لکھوں — ؟
فرمایا، چڑیا کی کہانی لکھو۔
''مرشد کی باتیں'' میں — ؟
کیوں، نہیں لکھ سکتے ؟
جی لکھ سکتا ہوں لیکن لکھنا کیا ہے — ؟
لکھو کہ وہ ایک صبح پرندوں کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ خواہش تھی کہ پرندوں سے دوستی ہو۔ باقاعدگی سے روز دانہ پانی رکھتا، ان کے قریب جاتے ہوئے یاحیی یاقیوم پڑھتا تاکہ ذکر کی لہروں کو محسوس کرکے پرندے اس سے خوف زدہ نہ ہوں اور دوستی کرلیں۔ صبح یا شام کو پودوں کے درمیان تخت پر رکھے مٹی کے دو بڑے برتنوں میں باجرا اور پانی ڈالنے جاتا تو تخت پر بیٹھے پرندے اڑ کر درختوں میں چھپ جاتے یا پھر بجلی کے تاروں پر بیٹھ جاتے۔ ہمت نہیں ہاری اور معمول جاری رکھا لیکن پرندوں سے دوستی نہ ہوسکی۔ پرندے آہٹ محسوس کرنے پر اڑ جاتے۔

مرشد کریم منظر بیان کررہے تھے اور وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی پلکیں جھپکنا کم سے کم ہوگئیں۔ آنکھ کی پتلی میں سرمئی اور نیلے کناروں کے درمیان روشنی کا ہجوم تھا۔ یہ منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لگتا تھا کہ روشنی یہاں سے نہ جانے کتنے عالمین میں بکھر کر اسکرین کو روشن کررہی ہے۔

پرندوں سے متعلق بات جاری تھی۔ انہوں نے فرمایا، اب لکھو کہ ذہن پرندوں سے دوستی کے نکتہ پر ٹھہرنے کی وجہ سے کیفیت خواب میں منتقل ہوئی۔ شعور کے اس پار لاشعور میں دیکھا کہ پرندے تخت کے بجائے مٹی پر بیٹھے ہیں، وہ پرندوں کے قریب گیا لیکن پرندے اڑے نہیں بلکہ مٹی پر قطار میں بے حس و حرکت ہوگئے جیسے انہوں نے خود کو نثار کردیا ہو۔ لہروں نے بتایا کہ پرندوں سے دوستی ہوگئی ہے۔ اتنا فرما کر وہ خاموش ہوگئے لیکن اسے آگہی کے سمندر میں پھینک دیا۔

یقین تھا کہ صاحبِ طریقت ماضی، حال اور مستقبل سے واقف ہیں۔ انہوں نے اُس کی زندگی کے اِس حصہ اور خواب کو پوری جزئیات کے ساتھ بیان کیا جیسے وہ منظر اس نے نہیں، انہوں نے دیکھا ہو۔

عرض کیا، کئی سال پہلے میری خواہش تھی کہ پرندوں سے دوستی ہوجائے لیکن نہیں ہوئی، یہاں تک کہ میں نے وہ خواب دیکھا جو آپ نے بیان کیا۔ میں حیران نہیں ہوں کہ آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہے۔ مجھے یقین حاصل ہوا ہے کہ میری زندگی آپ کے لئے کھلی کتاب ہے۔ خواب کی تعبیر کیا ہے — ؟ بیداری میں پرندوں سے دوستی نہیں ہوئی، خواب کی دنیا میں دوستی ہونے کا کیا مطلب ہے — ؟

فرمایا، گھر کے پاس رہنے والے پرندوں نے مٹی پر قطار میں بے جان بن کر آپ کو پیغام دیا تھا کہ ہم سے دوستی کرنی ہے تو مرنے سے پہلے مرجاؤ۔ اس ہستی کے لئے خود کو نثار کردو جس نے ہمیں اور تمہیں تخلیق کیا ہے، پھر ہم تمہارے دوست بن جائیں گے۔

خواب کی تعبیر سن کر وہ سکتہ میں آ گیا۔ چہرہ سرخ ہوا اور آنکھیں پانی بن گئیں۔

عرض کیا، خواب کی تعبیر سالوں بعد معلوم ہوئی۔ کیا میرے پاس وقت ہے یا میں نے وہ وقت کھو دیا ــــ؟

فرمایا، وقت نہیں گزرتا، موجود رہتا ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عرض کیا، آپ نے فرمایا کہ چڑیا پر کہانی لکھو، کہانی میں کیا لکھوں ــــ؟

فرمایا، پرندوں کی دنیا میں وقت گزارنے کے دوران ایک منظر آپ نے بار بار دیکھا۔ یاد ہے ــــ؟

سر نفی میں ہلایا۔

فرمایا، ایک چڑیا نسل کی افزائش کے لئے چھوٹے بڑے تنکے اٹھا کر گھر بنانے میں مصروف تھی۔

مرید کو یاد آ گیا اور کہا، جی وہ تنکے جمع کر کے گھونسلا بنا رہی تھی۔ ایک دن کچھ تنکے جمع کئے، اگلے دن کسی نے بکھیر دیئے۔ چڑیا کو افسوس ہوا لیکن وہ بھول گئی اور نئے سرے سے گھونسلا بنانا شروع کیا۔ اگر یاد رکھتی تو غم سے بوجھل ہو کر گھر بنانے سے رہ جاتی۔ بکھرے ہوئے تنکوں کو دیکھ کر وہ پھرتی سے اڑی جیسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ یک سوئی سے تنکے اٹھا کر لاتی رہی، انہیں ترتیب سے لگایا اور آخر کار گھر بنا لیا۔

فرمایا ــــ لکھو چڑیا ہمت نہیں ہارتی۔

الفاظ سادہ ــــ پیغام گہرا تھا۔

مرشد کریم سب کو یا حی یا قیوم پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہ بنیادی اسباق میں شامل ہے۔ ایک روز یا حی یا قیوم کے ورد کی بات آئی تو اس نے فخر سے بتایا کہ میں کثرت سے پڑھتا ہوں۔ انہوں نے الفاظ پر زور دیا، صرف پڑھو نہیں، دل سے پڑھو!

خامی کی نشان دہی ہونے سے عمل کی ریکارڈنگ دماغ میں چلتی ہے اور وہ دیکھتا ہے اس نے کب، کہاں اور کیا غلطی کی۔ احساس ہوا کہ یا حی یا قیوم پڑھتے ہوئے ذہن یک سو نہیں ہوتا ــــ کبھی یہ، کبھی وہ سوچتا ہے جس کی وجہ سے تاثر قائم نہیں ہوتا۔ اب ورد کرتے ہوئے دھیان رکھا کہ ذہن ذکر میں مرکوز رہے۔

پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ یا حی یا قیوم کی صفات تخلیق کے نظام پر محیط ہیں۔ ان الفاظ میں ایسا کیا ہے کہ کائنات اس کے دائرہ اثر میں ہے ــــ؟

لاشعور نے کہا، یا حی کے لفظی معنی زندہ رکھنے والا اور یا قیوم کے معنی قائم رکھنے والا کے ہیں۔ یا حی سے مراد خالق کا مخلوق کو اپنی ہستی سے منسلک رکھنا ہے ورنہ مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔ قیوم کا مطلب ہے اللہ نے اپنی صفات کے ذریعے مخلوق کو مقداروں میں قائم رکھا ہے۔ مخلوق خالق سے منسلک ہے لیکن اللہ ــــ اللہ ہے

اور مخلوق — مخلوق ہے۔ یا حیی یا قیوم کے ورد کا مفہوم یہ ہے کہ یا اللہ! مجھے اپنی ہستی میں زندہ اور قائم رکھ!

ردھم میں ورد سے کیف پیدا ہوا جو بے کیفی میں بدل گیا۔ محسوس ہوا کہ ماحول میں ڈائی مینشن ریزہ ریزہ ہو رہی ہیں۔ ورد میں کھونے سے اندر میں اور باہر سکوت ہم آہنگ ہو گیا۔ ''قیوم'' کی گونج نے وجود میں سنسناہٹ پیدا کی اور اس نے وجود کو کائنات میں تحلیل ہوتے محسوس کیا۔ ادراک ہوا کہ یا حیی یا قیوم کی لے نے کائنات کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے اور ہر تار میں مخفی سر ''قیوم'' کے ساتھ بج رہے ہیں۔

کیفیت ناقابل تذکرہ ہوئی تو کسی نے دل پر ہاتھ رکھا اور وہ خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد یا حیی یا قیوم کی آواز آنا شروع ہوئی۔ وہ خاموش لیکن گونج اس کی آواز میں تھی۔ چونک گیا۔ ذہن کو آواز پر مرکوز کیا تو آواز باہر سے نہیں، اندر میں سے آ رہی تھی۔

لہروں نے بتایا کہ دل یا حیی یا قیوم کا ورد کر رہا ہے۔ دل کی لہریں غالب ہوتے ہی کمرے میں موجود خلا کی آواز بھی یا حیی یا قیوم کی بازگشت بن گئی۔

ادراک ہوا کہ ہم جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ ماحول میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ یا حیی یا قیوم کا ردھم بازگشت بن کر ماحول میں محفوظ ہونے والی گونج کی گونجار بن گیا۔

خدا پرست ہے چل خانۂ خدا کی طرف

رجوع بندہ کی ہے اس طرح خدا کی طرف
پھرے ضمیرِ خبر جیسے مبتدا کی طرف

بعید کیا ہے مروت سے تیری اے شہ حسن
نگاہ لطف سے دیکھے جو تو گدا کی طرف

کہاں وہ زلف کہاں خونِ نافۂ آہو
جو مشک سمجھے ہیں وہ لوگ ہیں خطا کی طرف

الجھ کے شانہ سے کھاتا ہے سینکڑوں جھٹکے
قصور سے یہ ترے گیسوئے رسا کی طرف

خدا نے درد محبت عطا کیا ہے جسے
اسے توجہ خاطر نہیں دوا کی طرف

مَلا جو تم نے لہو دست و پا میں عاشق کا
نہ ہوگا میل طبیعت کو پھر حنا کی طرف

کرے گا یار مری جنگ غیر میں امداد
جو آشنا ہیں وہ ہوتے ہیں آشنا کی طرف

فراق یار میں رہتا ہے یوں تصورِ گور
خیال جیسے مسافر کا ہو سرا کی طرف

نہ ہوگا ہم سفرِ روح پیکرِ خاکی
یہ سوئے ارض رواں ہوگا وہ سما کی طرف

بہت خراب رہا بت کدہ میں اے آتشؔ
خدا پرست ہے چل خانۂ خدا کی طرف

(کلام: حیدر علی آتشؔ)

نعیم قریشی

اک لفظ تھا اک لفظ سے افسانہ ہوا

سعودی عرب میں قیام کے دوران الفاظ سے متعلق متعدد تجربات ہوئے اور تجربہ نے سوچنے پر مجبور کیا کہ جو الفاظ مختلف زبانوں میں ایک ہیں، ان کی کہانی ہر زبان میں الگ ہے۔ کیا لفظ الوژن نہیں ؟

حال ہی میں عمرہ کی ادائیگی کے لئے سعودی عرب کے سفر کے دوران کرنسی تبدیل کروانے کی ضرورت پڑی۔ کرنسی ایکسچینج کرنے گیا تو دیکھا دکان کی تختی پر ''صراف'' لکھا تھا۔ ذہن میں آیا کہ صراف تو سونے کے زیورات بنانے والے کو کہتے ہیں۔ اسی سوچ میں محو تھا کہ مزید الفاظ سامنے آئے جن کا اردو میں استعمال الگ اور عربی میں معنی کچھ اور تھے۔

ایک میڈیکل اسٹور پر لکھا تھا ''رعایۃ بلا حدود''۔ بادی النظر میں ایسا لگا جیسے اس اسٹور پر بہت رعایت (ڈسکاؤنٹ) ملتی ہے لیکن ''رعایۃ بلا حدود'' کے نیچے لکھی تحریر پر نظر گئی تو ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ انگریزی میں تحریر تھا، Unlimited Care یعنی مسلسل دیکھ بھال۔ اب پتہ چلا کہ رعایۃ عربی میں دیکھ بھال کو کہتے ہیں۔ بالکل ٹھیک — اسی لئے اردو میں عوام کو رعایا کہتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کی دیکھ بھال حکمران یا بادشاہ کا فرض ہے۔

میرا تعلق چوں کہ لکھنے پڑھنے سے ہے اس لئے الفاظ کی دنیا میں دلچسپی کے سبب جہاں جاتا ہوں، نئے الفاظ تلاش کرتا ہوں یا ایک جیسے الفاظ کے مختلف زبانوں میں استعمال کی طرف میری توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ ایک لفظ کے مختلف معنوں نے مجھے الفاظ کی دنیا کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ عربی الاصل ہیں پھر بھی عربی محاورہ میں ان کا مطلب کچھ اور ہے۔ موقف جس کی جمع مواقف ہے، ہماری زبان میں نقطۂ نظر کو کہتے ہیں اور عرب دنیا میں یہ لفظ کار پارکنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ موقف اور وقف کا کوئی تعلق ہو اور اسی کے پس منظر میں گاڑی روکنے کے مقام کے لئے عربی میں یہ لفظ موقف ہو گیا ہو۔

اسی طرح زحمۃ یعنی زحمت ہمارے یہاں تکلیف کو کہتے ہیں جب کہ عرب دنیا میں یہ ٹریفک کا غیر معمولی ہجوم یا ازدحام ہے۔ یہ لوگ معمول کے ٹریفک کو مرور کہتے ہیں۔ وہی مرور جو اردو میں مرورِ ایام کے لئے آتا

ہے جس کے معنی دنوں کا گزرنا ہے۔ہجوم کا مطلب اردو میں مجمع ہے اور عربی میں حملہ (attack) کرنے کو ہجوم کہتے ہیں۔

زبانیں ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ نئی زبان تشکیل پاتی ہے تو خطہ کی دیگر زبانوں یا ان ثقافتوں کا اثر اس میں شامل ہوتا ہے جن سے تجارت یا کسی بھی طرح سے وابستگی ہو۔ پھر جس نے زبان کو پروان چڑھایا، اس نے کسی زبان کے لفظ کو اپنی زبان میں الگ مطلب کیوں دیا—؟

ایک اور دل چسپ لفظ نکتہ ہے، اس کی جمع نکات ہے۔ ہمارے ہاں عقل و دانش پر مبنی بات نکتہ کہلاتی ہے اور عربی میں اس کا مطلب لطیفہ (joke) ہے ۔یہ پڑھنے سے پہلے کیا آپ کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ ہنسی مذاق کی بات کو عربی میں نکتہ کہتے ہیں؟

نکتہ کے دو متضاد مفہوم پڑھ کر فرد بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ الفاظ بذات خود کچھ نہیں، مفہوم سے وابستہ ہوکر ہر زبان میں مختلف ہو جاتے ہیں۔

ایک اور لفظ زبوں ہے۔ یہ علامہ اقبالؒ کی ایک رباعی میں استعمال ہوا ہے۔

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
تیرے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاکؐ ہے تو

ہماری زبان میں زبوں عاجز، ضعیف اور کم تر کو کہتے ہیں، یہی لفظ عرب دنیا میں کسٹمر یا صارف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔اس کی جمع زبائن ہے۔

سچ یہ ہے کہ اگر ہم الفاظ کی بھول بھلیوں سے نکل نہ سکیں تو ان الفاظ کا صیدِ زبوں بن جائیں۔

ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں:

’’ہم کبھی افسانوی زبان میں یا واقعاتی تذکروں میں کہتے ہیں کہ ہمارا گزر ایک بہت بڑے اور گھنے جنگل سے ہوا۔اس جنگل میں سائے تھے اور تیز ہوا کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ تاریک راتوں میں جب ہوا رک جاتی تو جنگل بھیانک سناٹے اور موت کا نمونہ بن جاتا۔ آپ ان جملوں کو چند بار پڑھئے اور غور کیجئے کہ بیان کرنے والے نے فی الواقع کوئی صحیح اور معین بات کہی ہے؟ یا قارئین کو صرف اندھیرے میں پھینک دیا ہے۔ بیان کرنے والے نے یہ بات بالکل نہیں بتائی کہ جنگل میں کون کون سے درخت تھے۔ان کا قد و قامت، ان کا رنگ و روپ، ان کے پھول پتیاں کس وضع کی تھیں اور ان درختوں سے ملحق کون کون سے پرندے، کس قسم کے جانور اور ان کی شکل وصورت کیا تھی۔ زمین اور چھوٹے پودے اور زمین پر اگی ہوئی گھاس، زمین کا اتار چڑھاؤ، زمین پر بہنے والا پانی، نرم ریت اور سخت پتھریلے علاقوں کے نقش و نگار کیا تھے۔اس جنگل میں کتنے آبشار، کتنے پہاڑ، کتنے ٹیلے اور کتنے ریگ زار تھے۔قارئین کبھی یہ نہیں سوچتے کہ بات کس قدر بے

سروپا کہی گئی ہے حالاں کہ وہ عبارت پڑھنے کے بعد کچھ نہیں سمجھتے بجز اس کے کہ جنگل کا ایک تصور ذہن میں بنا اور ذہن اس سے چمٹ کر سو گیا۔ اور صرف ایک سیکنڈ یا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں جاگ اٹھا اس امید پر کہ آگے اور کیا پیش آیا، قصہ گو اور کیا کہے گا۔ قارئین اس مقام تک پہنچ کر مگن ہوجاتے ہیں اور افسانہ نویس یا مقرر کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کی بھول بھلیاں علم کے تمام میدانوں میں عام ہیں۔ ان ہی بھول بھلیوں سے متعلق انسان نے کروڑ در کروڑ کتابیں لکھیں، کھرب در کھرب تقریریں کیں اور سنکھ در سنکھ روزمرہ گفتگوؤں کی داغ بیل ڈالی ہے۔''

شاعری اور افسانہ نگاری میں حقیقت کا رنگ نہ ہو تو یہ الفاظ کی بھول بھلیوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ سائنسی علوم بھی الفاظ کی بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایٹم، الیکٹرون کوارک وغیرہ ـــــ یہ وہ اصطلاحیں ہیں جن پر جدید طبیعیات اور کیمیا کی عمارت کھڑی ہے لیکن انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔

سائنس کہتی ہے کہ روشنی پڑنے پر یہ ذرّات اپنا راستہ بدل لیتے ہیں اور ہماری بصارت اسی روشنی پر منحصر ہے اس لئے ہم ان ذرّات کے صحیح مقام یا حرکت کی رفتار سے کبھی آگاہ نہیں ہوسکتے۔ اس قانون کو سائنسی دنیا میں بے یقینی کا قانون کہتے ہیں۔ اسے جرمن محقق ویرنر ہائزن برگ نے 1927ء میں پیش کیا تھا۔

اس کے برعکس آسمانی کتابیں شک اور بے یقینی سے پاک ہیں۔ قرآن کریم نے واضح کردیا ہے کہ،

''اس کتاب میں شک نہیں۔'' (البقرۃ: ۲)

الفاظ کی دنیا ایسی پر پیچ وادیوں اور رنگارنگ مناظر سے بھری ہوئی ہے جو ہمیں شے کی حقیقت سے آگاہ نہیں کرتے البتہ کچھ وقت کے لئے محظوظ اور مسحور کردیتے ہیں۔ الفاظ کا جادو تخیل کی وادی بن کر ہمیں خود ساختہ دنیا میں لے جاتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ سب کی دنیا الگ ہے جب کہ الگ نہیں ہے، ہم اسے مختلف کہتے ہیں۔ ہر باذوق فرد ادب کے ان شہ پاروں سے اپنے فہم وذوق کے مطابق لطف اندوز ہوتا ہے۔

الفاظ کی دنیا پُر اسرار اور سحر انگیز ہے۔ الفاظ رلاتے اور ہنساتے ہیں، خوف زدہ اور مرعوب بھی کرتے ہیں اور کبھی ہمارے اندر امنگ اور ولولہ پیدا ہوجاتا ہے۔ کلام جس مقصد کے لئے ہو، الفاظ میں ترتیب، اوزان برابر اور سوچ میں گہرائی ہو تو بلاشبہ دل پر اثر کرتا ہے۔

دن رات الفاظ سے ہمارا واسطہ رہتا ہے، وہ الفاظ جو ہم جانتے ہیں اور وہ الفاظ جن سے ہم ناواقف ہیں۔ کہنا غلط نہ ہوگا کہ الفاظ زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ شعور غالب ہوتے ہی فرد اپنی بات دوسروں تک پہنچانے اور دوسرے کی بات سننے کے لئے جس ذریعہ کا سہارا لیتا ہے وہ الفاظ ہیں۔ الفاظ دراصل مختلف آوازیں ہیں جن

کے معانی ان کو دیئے گئے مفہوم سے وابستہ ہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

کرگس — گدھ کو کہتے ہیں۔ جس جہاں میں یہ دونوں رہتے ہیں وہ ایک ہے لیکن کرگس اور شاہین کی صفات میں فرق کی وجہ سے دونوں کی دنیا ایک ہوکر بھی ایک نہیں۔ کرگس مردہ گوشت کھاتا ہے جب کہ شاہین کی خصوصیت ہے کہ وہ بلندیوں میں اڑتا ہے اور پہاڑ کی چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے۔

خیالات جس کے بغیر زندگی کی کوئی حرکت واقع نہیں ہوتی، تصویر کی شکل میں ذہن پر وارد ہوتے ہیں مگر سمجھ میں اس وقت آتے ہیں جب الفاظ کا جامہ پہنتے ہیں۔

خوشی محسوس ہوتی ہے تو ذہن میں اپنی اپنی زبان کے مطابق لفظ گونجتے ہیں۔ خوشی کے لئے اردو میں مسرت کا لفظ بھی مستعمل ہے، عربی میں فرح، انگریزی میں happiness، فارسی میں شادی کہتے ہیں۔

ان الفاظ کے پیچھے خدوخال ہوتے ہیں یا کسی شے کا نقش ہوتا ہے۔ نقش یا تصور کو ہم اس لفظ کے معنی کہتے ہیں۔ خوشی کے خیال سے نمودار ہونے والا تصور ہمیشہ خوشی کا ہوتا ہے چاہے فرد اپنی زبان میں اسے کوئی بھی نام دے۔

لفظ اور معنی کی مثال ظرف اور مظروف کی ہے۔ ظرف عربی میں برتن کو کہتے ہیں اور مظروف وہ شے ہے جو اس برتن میں ہو۔ پانی کا گلاس، بہتا دریا اور اڑتے بادل کی مثالیں لیجئے۔ گلاس، دریا اور بادل — تینوں ظرف ہیں اور تینوں الگ ہیں۔ ان کا مظروف ایک ہے یعنی پانی۔ اس کے برعکس چائے اور کافی کی مثال لیجیے۔ دونوں کا ظرف (برتن) ایک ہے یعنی کپ لیکن مظروف (ان میں رکھی اشیا) الگ الگ ہیں۔

ظرف کے ایک معنی سکت کے ہیں اور سکت کسی شے، صفت یا جذبہ کا احاطہ کرتی ہے۔ فرد کے اندر برداشت اور تحمل کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی ایسا برتن جس کی پہچان اس کی گہرائی سے ہو۔ شاعر نے کہا ہے،

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

دریا اور سمندر دونوں پانی کے برتن ہیں۔ دریا کی گہرائی کم اور سمندر کی زیادہ ہے۔ اسی لئے دریا میں شور زیادہ اور سمندر میں دریا کی بہ نسبت سکوت ہوتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں،

حرف ظرف آمد دو معنی چوں آب
بحر معنی عندہ ام الکتاب

ترجمہ: لفظ ظرف (برتن) ہے جس میں پانی کی طرح معانی بھرے ہوئے ہیں۔ معانی کا سمندر ام الکتاب (کتاب مبین) ہے۔

سعودی عرب میں قیام کے دوران الفاظ سے متعلق متعدد تجربات ہوئے اور تجربہ نے سوچنے پر مجبور کیا کہ

جو الفاظ مختلف زبانوں میں ایک ہیں، ان کی کہانی ہر زبان میں الگ ہے۔ کیا لفظ الوژن نہیں ــــ؟

آخر میں یہ بھی پڑھ لیجئے۔

ایک دکان کے باہر لکھا تھا خصم 50%۔ پڑھ کر میں چونک گیا اور بے ساختہ ہنسی آئی۔ عربی میں اس کا مطلب ہے پچاس فی صد ڈسکاؤنٹ۔ بھلا سوچئے اردو سے واقف مگر عربی سے ناواقف شخص جب اس کو پڑھے گا تو ذہن میں کیا خیال آئے گا۔

خصم کا لفظ اردو میں دشمن اور شوہر کے لئے آتا ہے۔ ایک لفظ کے دو متضاد معنی! ممکن ہے کہ شوہر اور دشمن میں کوئی قوی نسبت ہے جسے بیویاں بہتر سمجھ سکتی ہیں۔

اردو زبان میں لفظ خصومت، خصم سے ماخوذ ہے۔ خصومت کے معنی عداوت کے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

''کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ جھگڑالو (خصیم) بن کر کھڑا ہو گیا۔'' (یٰسٓ: ۷۷)

یہاں جھگڑالو کے لئے لفظ خصیم استعمال ہوا ہے جو خصم سے ماخوذ ہے لیکن ڈسکاؤنٹ یا کٹوتی کا مفہوم کہاں سے آ گیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

الفاظ تغیر کی وضاحت کے لئے بنائے گئے ہیں اس لئے تغیر کی طرح یہ بھی الوژن ہیں۔ الفاظ کا تعلق مفہوم سے ہے، مفہوم حقیقی دنیا یعنی تغیر سے ماورا دنیا سے منسلک ہو تو حقیقی ہے ورنہ ان کی حیثیت افسانہ سے زیادہ نہیں۔

الفاظ کی کہانی کو ابدالِ حق نے کمال علمی سے رباعی میں بیان کر کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

اک لفظ تھا اک لفظ سے افسانہ ہوا
اک شہر تھا اک شہر سے ویرانہ ہوا
گردوں نے ہزار عکس ڈالے ہیں عظیم
میں خاک ہوا خاک سے پیمانہ ہوا

ادبی لوگوں کا مزاح

★ گوپی ناتھ امنؔ جن دنوں زندگی اور موت کی کشمکش میں بستر پر دراز تھے، ڈاکٹر معائنہ کے لئے آیا تو امنؔ صاحب سے کہا، ذرا زبان نکالئے۔ گوپی ناتھ امنؔ نے مسکرا کر کہا، جناب! زبان درازی اچھی نہیں ہوتی۔

★ مشاعرہ شروع نہیں ہوا تھا۔ شاعر حضرات کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے فیصلہ ہوا کہ فرشی نشست ہو۔ چناں چہ گوپی ناتھ امنؔ نے شعرا کو کرسیوں سے فرش پر بلاتے ہوئے کہا، حضرات! اہلِ فن کا زوال ہو رہا ہے۔

تالیف: قرۃ العین واسطی

نیشاپوری ـــ بی بی فاطمہؒ

اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے تو معاشرہ سے ریاکاری ختم ہو جائے گی۔ جو شخص ہر وقت اللہ کا دھیان نہیں رکھتا وہ گناہوں کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔

نویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام میں بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ کا مقام نمایاں ہے۔ آپ نیشاپور کی فاطمہ کے نام سے بھی معروف ہیں۔ بلخ کے امیر کی بیٹی تھیں۔ آسائش اور ناز و نعم میں پرورش کے باوجود تغیر کی چکا چوند سے متاثر نہیں ہوئیں اور باطن میں خلا کو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے پُر کیا۔

دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں،

اچھی ہے بری ہے دہر فریاد نہ کر
جو کچھ کہ گزر گیا ہے اسے یاد نہ کر
دو چار نفس عمر ملی ہے تجھ کو
دو چار نفس عمر کو برباد نہ کر

مخلوق کا وجود ـــ خالق کائنات کے عرفان کے لئے ہے۔ معرفت الٰہی کے متضاد زندگی ایسی ہے کہ بندہ بازار میں نفیس لباس خریدنے آیا ہے مگر بازار کی چکا چوند میں مقصد کو بھول کر یہاں وہاں گھوم رہا ہے۔ وقت مقررہ کے بعد واپس جائے گا تو ہاتھ خالی ہوں گے۔ بازار کی رنگینی کام نہیں آئے گی۔ البتہ اس چکا چوند میں وہ اپنے لئے خوب صورت لباس تلاش کرتا تو گھومنے پھرنے کے ساتھ بازار آنے کا مقصد پورا ہو جاتا۔ مثال ناقص ہے لیکن ہر فرد کی زندگی سے منسلک ہے لہٰذا مثال سے بات ذہن میں بیٹھ جائے گی۔

ہم دنیا میں معرفت کے لئے آئے ہیں۔ رسول اللہؐ کی سنت پر عمل کر کے معرفت کی تلاش کو اولیت دے کر دنیا کی ہر نعمت سے استفادہ کریں تو دنیا وہ گلستان ہے جس کے ہر پھول کی مہک بنانے والے کا عرفان دیتی ہے۔ مہک سے انسیت کا قانون یہ ہے:

حکم شہ ابرارؐ پہ چلئے
خار بھی پھول بن جائیں گے
دشت نہ سمجھو اس دنیا کو
یہ دنیا گلزار بھی ہے
طوفانوں کا کیا ڈر ہم کو
اسوۂ احمدؐ اپنے لئے
دریا بھی ہے ساحل بھی ہے
ناؤ بھی ہے پتوار بھی ہے

بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ فرماتی ہیں،

''جو شخص اللہ کو محسوس نہیں کرتا وہ مخمصہ کا شکار رہتا ہے اس سے بار بار غلطیاں سرزد ہوتی ہیں چاہے وہ کوئی بھی ہو، کسی بھی محفل میں بیٹھے اور جس لہجہ میں بات کرے۔ اور جو شخص اللہ سے دوستی کرتا ہے وہ ضمیر کی راہ نمائی میں زندگی گزارتا ہے، وہ غیر ضروری بات نہیں کرتا اور چاہے جہاں بیٹھا ہو۔۔۔ پُروقار رہتا ہے۔''

بی بی فاطمہؒ نے اپنے وقت کے معروف صوفی ابو حامد احمد بن خضرویہؒ سے شادی کی۔ ایک کنیز کو احمد خضرویہؒ کے پاس بھیجا کہ میرے لئے شادی کا پیغام بھجوائیں۔ شیخ احمد خضرویہؒ جانتے تھے کہ خاتون کا تعلق دولت مند گھرانہ سے ہے لہٰذا معذرت کر لی۔ آپ نے پروانہ کرتے ہوئے کنیز کے ذریعے دوبارہ پیغام بھیجا کہ میں جانتی ہوں آپ عارف ہیں اور راستہ دیکھتے ہوئے چلتے ہیں مگر آپ راہ رَو ہیں، راہ بر نہیں۔

پیغام سن کر شیخ احمد خضرویہؒ نے ارادہ میں تبدیلی کی اور آپ کے لئے شادی کا پیغام بھجوایا۔ بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ کے والد شیخ احمد خضرویہؒ کے معتقد تھے، پیغام بخوشی منظور کیا۔ ناز و نعم میں پلی بڑھی تھیں، دلہن بن کر شیخ احمد خضرویہؒ کے گھر آئیں اور شوہر کی مالی استطاعت کے مطابق زندگی بسر کی۔ فرماتی ہیں،

''اللہ تعالیٰ سے محبت یہ ہے کہ وہ جس حال میں رکھے بندہ خوش و خرم رہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے شکوہ نہیں کرتے، راضی بہ رضا رہتے ہیں۔''

دولت مند باپ نے بیٹی کے لئے بے پناہ دولت چھوڑی لیکن مخیّر بیٹی نے اس دولت کو مساکین اور ضرورت مندوں پر خرچ کیا۔

فاطمہ نیشاپوریؒ ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ تھیں اور قرآن کریم کی روحانی تفہیم اور تصوف کے گہرے نکات بیان کرنے کے حوالہ سے مشہور تھیں۔ قرآن کے معنی و مفہوم بیان کرتیں تو سننے والا زبان سے ادا ہونے والے حکمت کے موتیوں سے متاثر ہوتا۔ عالم فاضل ان کی تقاریر سنتے اور حیران ہو جاتے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ اور شیخ ابو حفص الحدیدؒ ان کے معترف تھے۔ شیخ ابو حفصؒ فرماتے ہیں کہ،

''فاطمہؒ سے ملنے سے پہلے میں خواتین کی محفل میں شرکت پسند نہیں کرتا تھا لیکن جب فاطمہ نیشاپوریؒ کی باتیں سنیں تو تصحیح ہوئی کہ اللہ عزوجل کے نزدیک مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معرفت کی نعمت سے نوازتا ہے، اس میں مرد یا عورت کی تخصیص نہیں۔''

بی بی فاطمہؒ مشہور صوفی حضرت ذوالنون مصریؒ کی استاد بھی کہلاتی ہیں۔ زندگی کا بیش تر وقت مکہ اور یروشلم میں گزارا۔ ذوالنون مصریؒ کی فاطمہ نیشاپوریؒ سے مکہ کی زیارت کے دوران ملاقات ہوئی۔

بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ نے ان کے لئے تحفہ بھیجا جسے

انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں نذر و تحائف قبول کرنے سے خود کو عاجز پاتا ہوں۔

جواب میں بی بی فاطمہؒ نے فرمایا، صوفی ظاہر کو نہیں، سبب کو دیکھتا ہے۔

مراد یہ تھی کہ جو تحفہ پیش کیا گیا اس کا سبب دنیا کی غرض و غایت نہیں، اللہ کی محبت ہے۔ جب ذوالنون مصریؒ تک یہ بات پہنچی تو وہ آپ کی شخصیت و دانائی کے معترف ہونے کے ساتھ تعلیمات سے بھی مستفیض ہوئے۔ وہ فرماتے ہیں،

''بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ قرآنی حقائق و معارف کو اس خوبی سے بیان کرتی ہیں کہ ان کے بیان پر رشک آتا ہے۔''

آپ نے ان کی شاگردی اختیار کی اور فرمایا،

''فاطمہ اولیاء اللہ میں سے ہیں اور میری استاد ہیں۔''

ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں موجودہ دور میں صوفیائے کرام میں بلند مرتبہ کون ہے؟

حضرت ذولنون مصریؒ نے فرمایا،

''مکہ مکرمہ میں ایک خاتون ہیں جن کا نام فاطمہ نیشاپوریؒ ہے۔ ان کی تقاریر میں قرآن کریم کے معانی کی گہری سمجھ بوجھ ہے۔ میں ان کا فہم دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔''

ایک بار یروشلم میں قیام کے موقع پر ذوالنون مصریؒ نے بی بی فاطمہؒ سے نصیحت کی درخواست کی۔ فرمایا،

''کوئی بھی عمل کرتے وقت اخلاص کو مدنظر رکھو اور نفس کی پیروی نہ کرو۔''

سلطان العارفین بایزید بسطامیؒ بھی بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ سے متاثر تھے۔ ان کی تعریف میں فرمایا،

''میں نے فاطمہ نیشاپوریؒ کو باکمال پایا۔ جس مقام اور رمز کے بارے میں ان سے بات کی، وہ اس مقام سے گزر چکی تھیں اور رموز سے واقف تھیں۔ میں نے انہیں آگاہ پایا۔''

وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ،

''جو کوئی روحانی علوم میں جدوجہد کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ فاطمہ نیشاپوری جیسا اولوالعزم ہو، اس کے جیسی طلب رکھتا ہو اور اس کا طرز عمل اختیار کرے۔ جو کوئی بندگی سے واقف ہونا چاہتا ہے وہ اس دور میں فاطمہ نیشاپوری کو دیکھ لے۔''

بعض لوگوں نے آپ کو بیک وقت کئی مقامات پر دیکھا تو حیرت کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا:

''جو لوگ اپنی روح سے واقف ہو جاتے ہیں وہ زمان و مکان (Time and Space) کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔''

زمان و مکان کیا ہے — ؟ زندگی گھٹنے، بڑھنے اور گھٹنے پر قائم ہے۔ خانوادہ سلسلہ عظیمیہ فرماتے ہیں،

''بڑھنے اور گھٹنے کے عمل میں بڑھنا اور گھٹنا حرکت ہے۔ حرکت کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ میں تغیر نہیں ہے اور دوسرے رخ میں تغیر ہے۔ جہاں تغیر ہے، مکان ہے اور جہاں تغیر نہیں ہے، زمان ہے۔''

(کتاب: وقت)

اولیائے کرام سے جب کوئی خرق عادت صادر ہوتی ہے تو کرامت کہلاتی ہے اور یہی خرق عادت جب پیغمبروں کے ذریعے سامنے آتی ہے تو معجزہ کہلاتی ہے۔ چوں کہ اولیائے کرام کو حضور اکرمؐ سے خاص نسبت ہے اس لئے ان سے ایسے واقعات منظر عام پر آتے ہیں جن کی عقلی تشریح ممکن نہیں۔

اولیائے کرام ضرورت کے تحت کرامت کا اظہار کرتے ہیں اور نمائش سے حتی الامکان پرہیز کرتے ہیں۔ بی بی فاطمہؒ خرق عادت کو بھان متی کہتی تھیں۔

بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ کا قول ہے،

''اللہ کے دوست کے لئے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ مشاہدہ ہے۔''

زمان ومکان سے واقف ہستیوں کے بارے میں محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں،

''عالم انسانی کے یہ وہ قدسی نفس حضرات ہیں جو اپنے اندر کام کرنے والے کہکشانی نظام سے باخبر ہوجاتے ہیں۔ جب کوئی بندہ اپنے باطن سے واقف ہوجاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے سے زمان ومکان کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو وہ دیکھ لیتا ہے کہ سب کچھ اس کے اندر ہے۔ ذات انسانی کے اندر ایک نقطہ ہے اور نقطہ کائنات کی مائیکرو فلم ہے۔ اس نقطہ کو جب پھیلنے اور نشر ہونے کا موقع دیا جاتا ہے تو ساری کائنات دماغ کی اسکرین پر فلم بن کر متحرک ہوجاتی ہے۔'' (کتاب: آواز دوست)

بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ نے زندگی کا بیش تر حصہ بیت اللہ شریف میں گزارا اور خانہ کعبہ کی مجاورت کے فرائض بھی ادا کئے۔ جس طرح سے ممکن تھا، خود کو خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کیا۔

نماز کی حکمت سے واقف تھیں، شب بیداری میں نوافل کا اہتمام کرتیں اور ذوق وشوق سے عبادت کرتیں۔ کھانے میں سادگی کا خیال رکھتیں اور پیٹ بھر کر کھانے سے گریز کرتیں۔ لوگوں کو کھانا کھلانے کا خصوصی اہتمام کرتیں۔ کھانے میں عیب نکالنا سخت ناپسند تھا۔ اپنی درس گاہ میں آنے والی خواتین وحضرات کو تلقین کرتیں کہ جو ملے شکر ادا کر کے کھالینا چاہئے، عیب نکالنا اور ناشکری اللہ کو پسند نہیں۔

لوگوں سے فرماتی تھیں،

''کھانے میں عیب نکالنے سے مراد نعمت حقیقی کی ناشکری کرنا ہے۔''

معلوم ہوا کہ حضرت یحییٰ ابن معاذ رازیؒ شہر رے سے نیشاپور آرہے ہیں تو احمد خضرویہؒ نے انہیں گھر آنے کی دعوت دی۔ اہلیہ سے پوچھا، یحییٰ کی تواضع کے لئے کیا اہتمام کیا جائے ــــ؟

بی بی فاطمہؒ نے فرمایا، گائے اور دنبے ذبح کریں، اتنی تعداد میں ترکاری، موم بتی اور عطر کا اہتمام کریں۔ گدھے بھی ذبح کئے جائیں۔

شوہر نے پوچھا، ایک شخص کے لئے اتنا اہتمام۔ اور یہ بتاؤ کہ گدھا کس لئے؟ آپ نے فرمایا،

''جب اللہ کا کوئی دوست گھر پر مہمان ہو تو اس خوشی میں اس کی دعوت کے ساتھ اطراف میں موجود لوگوں سمیت دیگر مخلوقات کی دعوت بھی ضروری ہے۔ گدھے کا گوشت نواح میں موجود جانوروں کے لئے ہے۔''

شیخ خضرویہؒ اہلیہ کی رحم دلی اور خدمت خلق کے جذبہ سے بہت خوش ہوئے۔

بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ عقیدت مندوں کے دیئے گئے نذرانے لوگوں میں تقسیم کر دیتیں۔ عالم ہو یا عام آدمی، جس کسی کو مسئلہ درپیش ہوتا، ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ اس کا احسن حل بتاتیں۔ آپ فرماتی ہیں،

''اللہ مختلف طریقوں سے لوگوں کو اپنی جانب راغب کرتا ہے۔ ان پر آسانیاں بھی آتی ہیں اور آزمائشیں بھی۔ مشکل اور آسانی دونوں اس سبب سے ہیں کہ لوگ اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔''

اللہ اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ مخلوق مدد کے لئے صرف خالق سے رجوع کرے اور توکل رکھے۔ اللہ کا بندوں سے عہد ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ فرماتی ہیں،

''حالات کی موجیں اللہ کے خالص بندہ سے بار بار ٹکراتی ہیں تو وہ فوراً اللہ سے رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اسے حالات کی لہروں سے محفوظ رکھتے ہیں۔''

لوگوں کو تلقین کرتی تھیں کہ ہر عمل میں خلوص ہونا چاہئے۔ ہر کام اللہ کی رضا کے لئے ہو اور اسے کرتے وقت یقین ہونا چاہئے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ فرماتی تھیں،

''اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے تو معاشرہ سے ریاکاری ختم ہو جائے گی۔ جو شخص ہر وقت اللہ کا دھیان نہیں رکھتا وہ گناہوں کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔''

عارف اور عقیدت مند کی تعریف بیان کرتی ہیں کہ،

''جو شخص اللہ کے عرفان کے لئے تگ و دو کرتا ہے وہ عارف ہے۔ اور جو شخص اپنے اعمال و افعال کے بارے میں احتیاط برتتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے وہ معتقد ہے۔''

ایک روز بلخ سے ایک عقیدت مند خاتون ملاقات کے لئے آئیں اور عرض کیا، میں آپ کی خدمت کر کے اللہ سے قریب ہونا چاہتی ہوں۔

بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ نے خاتون سے فرمایا،

کیوں نہ تم اللہ کی خدمت کر کے میرے قریب ہو جاؤ۔

نرم گو اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ البتہ رشتوں میں اعتدال کو اہمیت دیتیں۔ ان کی لہروں میں رعب تھا جو مخاطب کے دل پر اثر کرتا اور ہر فرد احترام کو ملحوظ خاطر رکھتا۔ نصیحت کرتیں کہ،

''تکلف کی زیادتی سے محبت میں کمی ہوتی ہے اور تکلف کی زیادتی ریاکاری میں اضافہ کا موجب ہے۔''

آدمی کی زندگی خواہشات کے تابع گزرتی ہے۔ وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے کہ مگر دینے پر رضامند نہیں ہوتا۔ نفسانفسی نے معاشرہ کو بے سکونی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہر ایک کا مفاد دوسرے سے وابستہ ہے۔ فرد اپنے مفاد کے لئے دوسروں کو مجبور کرتا ہے مگر اپنی باری آنے پر انجان بن جاتا ہے۔ شے مل جاتی ہے، سکون نہیں ملتا۔ بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ فرماتی ہیں،

''خواہشات کو قابو کرنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ بندہ خواہشات پوری کرنے کے لئے تاریکی کی گہرائیوں میں چلا جائے۔''

بی بی فاطمہؒ کی حیات بتاتی ہے کہ آپ خود مختار، خود اعتماد اور مضبوط ارادہ کی حامل تھیں اور تصوف سے گہرا شغف تھا۔ قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھا۔ معنی و مفہوم پر غور کیا اور حکمت سے واقف ہوئیں۔ زیادہ تر مکہ معظّمہ میں قیام کرتی تھیں۔ کبھی کبھی بیت المقدس کی زیارت کے لئے جاتیں لیکن مکہ معظّمہ واپس آجاتی تھیں۔ عمر کے آخری دور میں بیت المقدس گئیں۔ عمرہ کی ادائیگی کے لئے واپس آئیں اور مکہ معظّمہ میں انتقال ہوا۔

اللہ سے محبت کرنے والوں کے لئے بی بی فاطمہ نیشاپوریؒ کا پیغام ہے کہ،

''تصور سے من کی پیاس بجھتی ہے، فکر آتش سوز پیدا کرتی ہے اور طلب مطلوب تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے۔''

میں سنوں کس کا فسانہ تیرے افسانے کے بعد

کیا حنا خوں ریز نکلی ہائے پس جانے کے بعد
بن گئی تلوار ان کے ہاتھ میں آنے کے بعد

جام جم کی دھوم ہے سارے جہاں میں ساقیا
مانتا ہوں میں بھی لیکن تیرے پیمانے کے بعد

شکریہ واعظ جو مجھ کو ترک مے کی دی صلاح
غور میں اس پر کروں گا ہوش میں آنے کے بعد

شمع معشوقوں کو سکھلاتی ہے طرز عاشقی
جل کے پروانہ سے پہلے بجھ کے پروانے کے بعد

میں کروں کس کا نظارہ دیکھ کر تیرا جمال
میں سنوں کس کا فسانہ تیرے افسانے کے بعد

شمع محفل کا ہوا یہ رنگ ان کے سامنے
پھول کی ہوتی ہے صورت جیسے مرجھانے کے بعد

سچ یہ کہتے ہیں کہ ہنسنے کی جگہ دنیا نہیں
چشم عبرت ہیں چمن کے پھول مرجھانے کے بعد

فکر و کاوش ہو تو نکلیں معنیٔ رنگیں جلیلؔ
لعل اگلتی ہے زباں خون جگر کھانے کے بعد

کیا حنا خوں ریز نکلی ہائے پس جانے کے بعد
بن گئی تلوار ان کے ہاتھ میں آنے کے بعد

(کلام: جلیلؔ مانک پوری)

پندرہ منٹ

کمرا چار دیواری پر مشتمل ایک اسپیس ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ لوگ اسے چار دیواری کیوں کہتے ہیں جب کہ کمرے میں چھت اور زمین بھی ہوتی ہے۔ کمرا دراصل چھ دیواروں پر مشتمل ہے۔

لکھنا ــــ لاشعوری تحریکات کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ لکھنے کی خواہش رکھنے والے ہر فرد کو اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہئے کیوں یہ اظہار بیان میں روانی کے ساتھ جسمانی اور ذہنی فوائد کا ایک ذریعہ ہے۔ لکھنا ڈائری کی صورت میں ہو، انٹرنیٹ پر مختلف سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، تفکر کے نتیجہ میں یا کتاب پڑھ کر مضمون لکھا جائے، فائدہ بہرصورت ہوتا ہے۔

لکھنا ایسی صلاحیت ہے جس سے گھبراہٹ میں کمی اور اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذہن پر کسی چیز کا بار ہو تو مشورہ دیا جاتا ہے کہ دل میں موجود جذبات کو کاغذ پر اتار لو یا پھر ڈائری لکھا کرو تاکہ غبار باہر آئے اور منفی خیالات کی تکرار سے ذہن محفوظ رہے۔

محقق لکھنے کی مشق کے کئی فوائد بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لکھنے کی مشق سے سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے کیوں کہ لکھنے والا ہر چیز پر غور کرتا ہے، لکھتے وقت اس شے کا تجزیہ کرتا ہے اور جو جزئیات سامنے آتی ہیں، اسے کاغذ پر اتار لیتا ہے۔

ایک تحقیق کی گئی جس میں معلوم کیا گیا کہ امتحان سر پر ہوں تو طالب علم پڑھنے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ تحقیق کے دوران ہر طالب علم کو پڑھنے کے لئے مختصر تحریر دی گئی اور تین گروپ بنائے گئے۔ پہلے گروپ نے رٹا لگایا، دوسرے نے نقشوں کی مدد سے سمجھنے کے بعد تحریر کو یاد کرنے کی کوشش کی اور تیسرے گروپ نے تحریر پڑھ کر جو کچھ سمجھ میں آیا، دس منٹ تک لکھنے کی مشق کی۔ ایک ہفتہ کے بعد یادداشت کا امتحان لیا گیا تو تیسرے گروپ کی کارکردگی بہتر تھی۔

دیگر گروپوں کا تجزیہ کیا جائے تو دوسرے گروپ کی کاوش بھی اچھی تھی، انہوں نے تحریر کو سمجھنے کے لئے نقشہ بنایا لیکن اس کے بعد تحریر کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ نقشہ بنانے کے بعد جو انہوں نے سمجھا، اسے یاد کرنے کے بجائے لکھنے کی مشق کرتے تو ان کی کارکردگی تیسرے گروپ سے بہتر ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں

نے نقشہ یا تصویر کی مدد سے سمجھنا چاہا جس سے مفہوم بآسانی ذہن میں نقش ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لکھنے کی مشق میں پورا جسم اور ذہن ایک نکتہ پر مرتکز ہوجاتا ہے اور توجہ تحریر پر ہوتی ہے، لفظ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں مگر لکھنے سے الفاظ کا نقش ذہن کی اسکرین پر گہرا ہوتا جاتا ہے کیوں کہ وہ الفاظ اندر سے باہر منعکس ہوئے ہیں، ان کی اصل ذہن میں ہے۔

لکھنے کی مشق سے ذہنی پریشانی کم ہوجاتی ہے۔ پہلی تحقیق کی طرح اس تجربہ کے لئے ان طالب علموں کا انتخاب کیا گیا جن کے امتحان قریب تھے۔ طلبا سے کہا گیا کہ وہ اپنی پریشانیوں کے بارے میں لکھیں۔ ایک گروپ کو امتحان سے پہلے کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ دوسرے گروپ کے ذہن پر دباؤ ڈالنے کے لئے کہا گیا کہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طالب علم کو انعام دیا جائے گا۔ ہر رکن سے کہا گیا کہ ٹیم ورک ہونے کی وجہ سے گروپ کے باقی لوگوں کی کارکردگی کی ذمہ داری بھی اس پر ہے۔

پہلے گروپ کی کارکردگی میں پانچ فی صد اور دوسرا گروپ جس پر اضافی بوجھ ڈالا گیا تھا، ان کی کارکردگی میں 12 فی صد اضافہ دیکھا گیا۔ پریشانی کے بارے میں لکھنے سے ذہن پر موجود دباؤ کم ہوتا گیا۔ توجہ مرکوز ہونے سے ذہن سے خیال حذف ہوگیا کہ دوسروں کی ذمہ داری بھی ان پر ہے۔

ذہن پر منفی دباؤ سے یادداشت متاثر ہوتی ہے۔ لکھنے کی مشق سے پریشانی اندر نہیں رہتی، ذہن پر پریشانی کی گرفت سے کافی حد تک نکل آتا ہے کیوں کہ پریشانی الفاظ کی صورت میں ذہن سے نکل جاتی ہے۔ بوجھ ہلکا ہونے سے ایک مرحلہ پر پریشانی غیر اہم محسوس ہوتی ہے یا پھر حل نکل آتا ہے۔ محقق کہتے ہیں کہ کسی بھی دباؤ یا پریشان کن صورت حال سے نمٹنے کے لئے اس قسم کی لکھائی سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

صدمہ پر قابو پانا لکھنے کی مشق سے ممکن ہے۔ اس موضوع پر طویل عرصہ سے کام ہورہا ہے۔ 1986ء میں ایک تحقیق کے دوران کالج کے طالب علموں سے کہا گیا کہ ایسے واقعہ پر مضمون لکھیں جس سے انہیں سب سے زیادہ صدمہ پہنچا اور وہ اس کے اثر سے نہیں نکل سکے۔ تحریر کا دورانیہ 15 منٹ تھا۔ یہ مشق مسلسل چار روز تک دہرائی گئی۔ کچھ عرصہ بعد مشق میں حصہ لینے والوں کی صحت پہلے سے بہتر ہوگئی۔

عام طور پر لکھنے کی مشق میں حصہ لینے والوں کو جو ہدایات دی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:

''ان خیالات اور احساسات کے بارے میں لکھئے جنہوں نے آپ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ والدین، دوستوں اور رشتہ داروں سے تعلقات کو تحریر میں شامل کرسکتے ہیں۔ آپ کیا تھے، کیا ہیں اور مستقبل میں کیا بننا چاہتے ہیں۔ چاہیں تو ایک مسئلہ پر لکھئے یا ہر روز مسئلہ یا موضوع الگ ہوسکتا ہے۔ جو آپ نے لکھا، وہ

'راز' رہے گا۔ لکھتے ہوئے گرامر، ہجے اور جملے کے صحیح غلط ہونے پر توجہ نہ دیں۔ جب تک وقت پورا نہیں ہوتا، مسلسل لکھتے رہیں۔

ان باتوں پر لکھنے سے یہ فوائد سامنے آئے۔

۱۔ مزاج میں بہتری

۲۔ ذہن پُرسکون ہونا

۳۔ ڈپریشن میں کمی

۴۔ شدید صدمہ کے بعد ذہنی دباؤ میں کمی

محقق کہتے ہیں کہ لکھنے کی مشق سے حادثات اور تلخ یادوں کا بوجھ ذہن سے زائل ہوتا ہے اور آدمی وقت سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

آزاد اور پابند ــــ لکھنے کی مشق کے دو طریقے ہیں۔

آزاد تحریر وہ ہے جس میں فرد سے کہا جائے کہ سوچے سمجھے بغیر جو کچھ ذہن میں آتا ہے، لکھنا شروع کر دو۔ لکھتے ہوئے رکنا نہیں، جملوں کی ساخت اور الفاظ کے انتخاب پر غور نہیں کرنا نہ یہ سوچنا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ اس کے برعکس ہدایات کے مطابق لکھنے میں فرد موضوع کا پابند ہوتا ہے البتہ دیگر قواعد یکساں ہیں۔

دونوں طریقوں کے مطابق لکھنے کی کوشش پڑھئے۔

آزاد لکھائی کی مثال:

''میں لکھنے بیٹھا، علم میں نہیں تھا کہ میں کیا لکھوں گا۔ لکھنا شروع کیا تو جملے ذہن میں آتے گئے اور میں نے سوچا کہ یہ جملے کہاں سے آ رہے ہیں۔ اس دوران مجھے اپنا ذہن سن ہوتا محسوس ہوا لیکن انگلیوں کی حرکت جاری رہی اور کاغذ پر لفظ نقش ہوتے گئے۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ مجھے کسی چیز کے بارے میں سوچنا نہیں ہے، بس لکھتے جانا ہے۔ لکھتے ہوئے پیاس محسوس ہوئی۔ مجھے حیرت ہے کہ جب توجہ لکھنے پر مرکوز ہے تو پیاس کا خیال کیسے آ گیا۔ پیاس کا خیال آنے سے توجہ لکھنے سے ہٹ گئی۔ پندرہ منٹ گزرنے کے بعد میں پانی پیوں گا، پانی کے لئے صبر میں کر سکتا ہوں۔ اب پیاس کا خیال مجھے تنگ نہیں کر رہا بلکہ ذہن پندرہ منٹ پر مرکوز ہو گیا ہے۔ پندرہ منٹ کیا ہیں؟''

دوسرے طریقہ پر عمل کے لئے پاس بیٹھے دوست سے میں نے پوچھا کہ بتاؤ کس موضوع پر تحریر لکھوں۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا، ایک لمحہ کو میری طرف متوجہ ہوا اور پھر ''کمرا'' کہہ کر دوبارہ کام میں مشغول ہو گیا۔ موضوع سن کر ذہن پر دباؤ محسوس ہوا۔ یہ پابند ہونے کا دباؤ تھا۔

پابند تحریر کی مثال:

''کمرا چار دیواری پر مشتمل ایک اسپیس ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ لوگ اسے چار دیواری کیوں کہتے ہیں جب کہ کمرے میں چھت اور زمین بھی ہوتی ہے۔ کمرا دراصل چھ دیواروں پر مشتمل ہے۔ دیوار رکاوٹ ہوتی ہے، ہمارے لئے چھت بھی رکاوٹ ہے اور زمین بھی۔ نہ ہم کمرے میں بیٹھ کر چھت کے اوپر دیکھ سکتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور نہ زمین کے اوپر بیٹھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ زمین کے اندر کیا ہو رہا ہے، کون سی دنیا آباد ہے۔ بات کمرے کی ہے۔ کمرا کیا ہے؟ اسپیس ہے جس نے فرد کو محدود کر دیا ہے۔ محدودیت کی وجہ

سے میں نے کمرے کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا۔ کمرے کے درمیان میں اسپیس عجیب وغریب تخلیق ہے۔اس اسپیس سے گزر کر کوئی ٹکراتا نہیں ہے۔اس اسپیس میں اتنی توانائی کام کر رہی ہے کہ اس نے چھ دیواروں کو ایک دوسرے سے دور رکھا ہوا ہے۔''

دونوں تحریر لکھتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔میرے لئے یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ذہن ہلکا محسوس ہوا جیسے بوجھ سے آزاد ہو رہا ہو۔دل چسپ بات یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کسی بھی موضوع پر فوری لکھ سکتا ہوں۔دونوں تجربات میں سوائے موضوع کے فرق کے میں کسی چیز کا پابند نہیں تھا۔

لکھنے کی مشق کا بنیادی مقصد ذہنی تناؤ میں کمی اور تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ہے۔ہر فرد باصلاحیت ہے، ذہنی تناؤ سے صلاحیت مغلوب ہوتی ہے اور فرد خود کو نااہل سمجھ کر احساس کم تری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔تناؤ کو ختم کر دیا جائے تو مسائل حل ہو جائیں گے۔

تناؤ کیا ہے — ؟ کشمکش ہے جس سے خلیات میں کھچاؤ پیدا ہوتا ہے۔کھچاؤ کا نتیجہ دباؤ ہے۔دباؤ خیالات کی روانی کو متاثر کرتا ہے اور خیالات قبول کرنے کی صلاحیت کم زور ہو جاتی ہے۔

آپ کا تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو، خامیوں پر قابو پانے کے لئے لکھنے کی مشق کیجئے۔بڑے سے بڑا افسر سامنے ہو یا چھوٹا کلرک — آپ بات کرتے ہوئے گھبرائیں گے نہ ماتحتوں سے سختی سے پیش آئیں گے کیوں کہ لکھنے سے مزاج میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ٹھہراؤ سے سانس لینے کا عمل اعتدال میں رہتا ہے۔اس طرح کسی کے سامنے جاتے ہوئے سانس نہیں پھولتا۔

اگر ہر ادارہ ملازمین کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے لکھنے کی مشق کو تربیتی پروگرام میں شامل کر لے تو اس سے توجہ میں مرکزیت پیدا ہوگی اور وہ نفسیاتی طور پر مضبوط ہوں گے۔

لکھنے کی مشق کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی دوسروں سے منفی طور پر متاثر نہیں ہوتا۔قارئین سوچیں گے کہ کیا یہ اتنا آسان ہے؟ جی ہاں! لکھنے کی مشق سے بندہ اپنا سامنا کرنا سیکھتا ہے، خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہوتا ہے اور ان کی وجوہات جان لیتا ہے۔خود کو پڑھنے والا ہر شے کو پڑھتا ہے، اس طرح وہ ماحول سے اچھی باتیں قبول کرتا ہے لیکن منفی باتوں اور رویوں کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا اور نہ اپنے اندر بوجھ رہنے دیتا ہے۔

اگر آپ لکھنے کے عادی نہیں ہیں تو ایک ہفتہ تک پندرہ منٹ لکھنے کو معمول میں شامل کیجئے۔پریشانی، خوف، اندیشے اور وہ تمام مسائل جن سے آپ گزر رہے ہوں، ان کے بارے میں لکھیں۔کسی مسئلہ میں الجھ گئے ہیں تو اس کا ممکنہ حل بھی لکھئے۔کوشش کریں کہ پندرہ منٹ کی یہ لکھائی بغیر وقفہ کے ہو۔ساتویں روز لکھائی کے تجربہ کو قلم بند کیجئے۔اب جو کچھ لکھا ہے اسے ایک ہفتہ کے بعد یعنی آٹھویں روز پڑھئے۔

حامد ابراہیم

آنکھ میں 30 ہزار لینس

یہ جسم کے مخصوص حصوں کو رگڑ کر الٹرا ساؤنڈ سگنل پیدا کرتی ہیں۔ ان کے بڑے دشمن چمگاڈر ہیں جو آواز کی لہروں سے اپنے شکار کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہ پتنگے الٹرا ساؤنڈ سگنل پیدا کر کے چمگاڈر کے پیدا کردہ سگنلوں میں خلل پیدا کرتے ہیں تا کہ شکار بننے سے محفوظ رہیں۔

حشرات الارض ــــ حیوانات میں سب سے بڑا اور متنوع گروہ ہے۔ ان کا تعلق حیوانات کی غیر فقاری* شاخ سے ہے۔ اس گروہ میں موجود ہر نوع ساخت اور خصوصیت کی بنا پر منفرد ہے۔ بیش تر حشرات ان روشنیوں کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جنہیں آدمی دیکھنے سے قاصر ہے۔ سماعت، لمس اور شامہ کے حواس ان میں حیران کن حد تک حساس اور فعال ہیں۔

حشرات الارض کی زندگی کا ہر پہلو عجائبات سے بھرپور ہے۔ قرآن کریم کی تین سورتیں نحل، نمل اور عنکبوت کے نام سے ہیں۔

علاوہ ازیں قرآن کریم میں حشرات الارض کے گروہ کی آٹھ انواع کا ذکر ہے جن میں مچھر (بعوضۃ)، مکھی (ذباب)، شہد کی مکھی (نحل)، مکڑی (عنکبوت)، چیونٹی (نمل)، پتنگے (فراش)، ٹڈی دل (جراد)، جوں (قمل) شامل ہے۔

۱۔ ''بے شک اللہ کو اس بات سے کوئی عار نہیں کہ وہ مثال دے جیسے مچھر یا اس سے بڑھ کر۔'' (البقرۃ: ۲۶)

۲۔ ''بے شک جنہیں اللہ کے سوا تم پوجتے ہو ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے اگر چہ وہ سب اس کام کے لئے جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس چیز کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔'' (الحج: ۷۳)

۳۔ ''اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا۔'' (النحل: ۶۸)

۴۔ ''ایسے لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو کارساز بنا لیا ہے مکڑی کی مثال جیسی ہے جس نے اپنے لئے گھر بنایا اور بے شک سب گھروں سے زیادہ کم زور ہے مکڑی کا گھر۔ کاش یہ لوگ جانتے۔'' (العنکبوت: ۴۱)

۵۔ ''یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں چلی جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمہیں

*غیر فقاری (بغیر ہڈی والے)

کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔'' (النمل: ۱۸)

۶۔''جس دن سارے لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے۔'' (القارعۃ:۴)

۷۔''پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان اور ٹڈی دَل اور جوئیں۔ (الاعراف: ۱۳۳)

ان آیات سے حشرات کی اہمیت اور حیران کن صفات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے حشرات الارض کی انواع کا ذکر مثالوں سے مختلف پیرایوں میں فرمایا ہے اور نوع آدم کو دعوت دی ہے کہ وہ گروہ حشرات پر تفکر کریں اور ان کے اندر چھپی ہوئی اللہ کی نشانیوں سے واقف ہوں۔

حشرات پر کام کرنے والے ایک امریکی ادارہ کے مطابق اب تک حشرات کی نو سے دس لاکھ اقسام معلوم کی جاسکی ہیں جو زمین پر حشرات کی اصل تعداد کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حشرات کے خاندان اور اقسام میں اتنا زیادہ تنوع ہے کہ روزانہ کے حساب سے سینکڑوں اقسام دریافت کی جائیں اور ان کی درجہ بندی کی جائے پھر بھی یہ سلسلہ ختم نہ ہو۔

حشرات کی انواع اور ان کی ذیلی اقسام کی تعداد کے بارے میں ماہرین حیاتیات حتمی نتیجہ پر متفق نہیں۔ محتاط اندازہ کے مطابق بیس لاکھ اقسام کی انواع موجود ہوسکتی ہیں ۔ یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ حشرات کی اقسام تیس کروڑ سے زائد ہوسکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حشرات الارض کی تعداد اور اقسام بتانے سے ماہرین قاصر ہیں۔

چیونٹیوں کی بعض قسمیں بڑی کالونیاں بناتی ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ ان کالونیوں میں لاکھوں چیونٹیاں بستی ہیں۔ دیمک کی ایک کالونی میں 60ہزار سے 20 لاکھ تک افراد بستے ہیں جب کہ ایک ٹڈی دَل میں اربوں ٹڈیاں موجود ہوتی ہیں۔

حشرات کا اتنی بڑی تعداد میں موجود ہونا ان کے حجم اور ان میں افزائش نسل کی غیر معمولی صلاحیت پر منحصر ہے۔ایک اندازہ کے مطابق دیمک کی ملکہ روزانہ تقریباً30 ہزار انڈے دیتی ہے۔

خام اندازہ کے مطابق کرۂ ارض پر ایک آدمی کے مدمقابل حشرات کی تعداد بیس کروڑ کے لگ بھگ ہوسکتی ہے۔

حشرات میں حواس: حشرات الارض میں حواس سے متعلق اعضا کی ساخت ممالیہ اور دوسرے فقاری حیوانات سے بالکل مختلف ہے۔

بصارت: حشرات کے حواس میں سب سے عجیب و غریب حس بصارت کی ہے۔ وجہ ان کی آنکھوں کی منفرد ساخت ہے ۔عموماً آنکھ کے حوالہ سے تاثر ابھرتا ہے کہ یہ لینس پر مشتمل کیمرہ ہے جس میں روشنی کو کم یا زیادہ کرنے کا انتظام ہے لیکن کیڑوں میں آنکھ کی صورت اور ساخت بالکل الگ ہے ۔محقق اسے مرکب آنکھ

(compound eye) کہتے ہیں۔

کمپاؤنڈ آنکھ ایک لینس کے بجائے سینکڑوں اور بعض اوقات ہزاروں لینسوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ تمام لینس الگ الگ شبیہ بنانے کے بجائے ایک مرکز پر روشنی کا ارتکاز کرتے ہیں۔ نتیجہ میں انتہائی واضح اور روشن ایک شبیہ بنتی ہے۔

محقق کہتے ہیں کہ یہ ہمارا اندازہ ہے کہ الگ الگ لینس مل کر ایک شبیہ بناتے ہیں ورنہ حشرات کی آنکھ سے چیزیں کتنی واضح اور کیسی نظر آتی ہیں اس کے بارے میں کیڑا ہی بتا سکتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ حشرات کی آنکھیں زیادہ تر 300° سے 360° کے قریب تک کروی زاویوں میں دیکھ سکتی ہیں۔ یعنی بیک وقت دائیں بائیں، اوپر نیچے، سامنے حتیٰ کہ کسی حد تک پیچھے بھی دیکھ سکتی ہیں۔

مزید یہ کہ مرکب آنکھوں کے علاوہ کیڑوں میں سادہ آنکھیں بھی موجود ہیں۔ کسی حشرہ میں اگر دو آنکھیں مرکب ہیں تو دو، چار یا چھ سادہ آنکھیں بھی عموماً موجود ہوتی ہیں۔ سادہ آنکھ سے مراد ایک لینس پر مشتمل آنکھ ہے۔ چناں چہ مرکب اور سادہ دونوں طرح کی آنکھیں مل کر بصارت کی حس کو غیر معمولی ہیئت اور فعالیت بخشتی ہیں۔

مرکب آنکھ کی مثال جدید دور میں pixel اور ان سے مل کر بننے والی تصویر سے دی جاسکتی ہے۔ سینکڑوں ہزاروں لینس ایک منظر کو چھوٹے چھوٹے تصویری ٹکڑوں یا پکسل میں تقسیم کر کے دوبارہ یک جا کرتے ہیں۔ اس سے منسلک سادہ آنکھیں منظر کو اندھیرے اور روشنی کے اعتبار سے واضح کرتی ہیں۔ اس طرح دماغ تمام بصری اطلاعات کی واضح اور اعلیٰ تصویر بناتا ہے جس کی مدد سے کیڑا گردوپیش سے باخبر رہتا ہے۔

حشرات میں ایک نوع ڈریگن فلائی ہے جس کی دو مرکب آنکھوں میں ہر ایک پر تقریباً تیس ہزار لینس نصب ہیں۔ ایک آنکھ ایک نصف کرہ کی صورت میں ہے۔ چناں چہ دونوں نصف کرے مل کر 360° کا بصری میدان تخلیق کرتے ہیں۔ اس کے برعکس آدمی (انسان نہیں) کی آنکھ تقریباً 114° کے بصری میدان میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اسی طرح مکڑی (spider) کی زیادہ تر اقسام میں آنکھوں کے چار جوڑے موجود ہیں۔ ہر جوڑا حجم میں دوسرے سے مختلف ہے۔ مکڑی کی آنکھیں سادہ اور مرکب ساخت کے بین بین (درمیان) ہیں۔

اگر مکڑی کی آنکھ کا ایک جوڑا منظر کو واضح کرتا ہے
تو دوسرا روشنی کی کمی بیشی کو ناپتا ہے
تیسرا گردوپیش کی حرکات وضاحت سے دیکھتا ہے
اور چوتھا رنگوں میں تمیز کرتا ہے

اس طرح مکڑی ایک جوڑے سے تمام بصری اطلاعات وصول کرنے کے بجائے چار جوڑوں سے منقسم اطلاعات وصول کرتی ہے جس سے بصری

کارکردگی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

سماعت: حشرات میں سماعت کی حس کسی مخصوص حصہ یا عضو کے بجائے جسم کے مختلف حصوں اور بعض میں تو تمام جسم میں پھیلی ہوتی ہے۔یعنی سارا جسم یا زیادہ تر حصے صوتی ارتعاش کے لئے کان کے پردہ کی طرح حساس ہیں۔بعض کے پردوں کا نچلا حصہ سماعت کا کام کرتا ہے۔بعض حشرات کے پیٹ اور ٹانگوں پہ موجود حساس جھلی آواز کی لہریں قبول کرتی ہے۔

پتنگوں کی ایک قسم (hawkmoths) الٹراساؤنڈ لہریں سننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یہ جسم کے مخصوص حصوں کو رگڑ کر الٹراساؤنڈ سگنل پیدا کرتی ہیں۔ان کے بڑے دشمن چمگاڈر ہیں جو آواز کی لہروں سے اپنے شکار کا اندازہ کرتے ہیں۔یہ پتنگے الٹراساؤنڈ سگنل پیدا کر کے چمگاڈر کے پیدا کردہ سگنلوں میں خلل پیدا کرتے ہیں تا کہ شکار بننے سے محفوظ رہیں۔ہاک موتھ کی سننے اور آواز پیدا کرنے کی صلاحیت آدمی سے زیادہ ہے۔اسی طرح جھینگر کی بعض اقسام 80 ہزار ہرٹز سے اوپر الٹراساؤنڈ پیدا کر سکتی ہیں جب کہ آدمی 20 سے 20 ہزار ہرٹز تک کی آوازیں سنتا ہے۔

دوسرے حواس: حواس کے ہر شعبہ میں حشرات غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔جھینگر کئی اعتبار سے عجیب وغریب خصوصیات کے حامل ہیں۔یہ زیر زمین سترہ دن تک لاروا اور پیوپا کی حالت سے گزر کر بلوغت کے مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں اور گرمیوں میں صبح سے شام تک مختلف آوازیں نکالتے ہیں۔ان میں آواز پیدا کرنے کے مخصوص اعضا پیٹ کے اندر موجود ہیں جب کہ سماعت کے لئے دھڑ اور ٹانگوں کے کچھ حصے مخصوص ہیں۔

ایک قسم کے جھینگر ایسے ہیں کہ 100 ڈیسیبل (decibel) سے زیادہ طاقت ور آواز پیدا کر سکتے ہیں۔یہ اتنی بلند آواز ہے کہ ہمارے کانوں کے لئے تکلیف دہ ہے۔بعض جھینگر جس فریکوئنسی کی آواز پیدا کرتے ہیں وہ دوسرے جانوروں کی سماعت کے لئے نقصان دہ اور آدمی کے لئے ناقابل سماعت ہے۔

صوتی اور برقی مقناطیسی ارتعاش محسوس کرنے کے لئے حشرات کے سر پر قدرت نے اینٹینا نصب کیا ہے۔نر مچھر اپنے اینٹینا سے مادہ مچھر کے پروں کی رفتار، ارتعاش اور ممکنہ فاصلہ کا اندازہ کرتے ہیں۔ان میں موجود اینٹینا اپنی ساخت میں انتہائی حساس اور فریکوئنسی کی وسیع حدود کے لئے بنا ہے۔

پیغام رسانی: حشرات میں لہروں کے ذریعے تبادلہ خیال، کیمیائی مرکبات کی مدد سے اپنی نوع کے دوسرے افراد کو آگاہ کرنا اور مختلف حرکات کے ذریعے خبردار کرنا عام ہے۔یہ ایسے طریقہ کار ہیں جو نوع آدم میں عام نہیں۔

مثال کے طور پر ایک آدمی دوسرے کا شکر گزار ہے اور اظہار کے لئے الفاظ کی مدد سے شکریہ کہتا ہے۔ لگے بندھے اصول کے تحت دوسرا فرد ردعمل میں شکریہ یا اس جیسا دوسرا لفظ ادا کرتا ہے۔

حشرات اور دوسرے حیوانات میں تبادلۂ خیال کا جو طریقہ مروج ہے اس میں مخاطب سامعین کو کوڈز پر مبنی مختصر اطلاع بھیجتا ہے جسے وصول کنندہ ڈی کوڈ کر کے تفصیلی معانی میں سمجھتا ہے۔ اس طرح کم وقت میں تیز اور مؤثر پیغام رسانی انجام پاتی ہے۔

الفاظ استعمال کئے بغیر تبادلۂ خیال حشرات میں عام ہے کیوں کہ اطلاع جب الفاظ کا جامہ نہیں پہنتی تو اپنے عمل میں زیادہ مؤثر اور تیز تر ہوتی ہے۔ باطنی علوم کے ماہرین یہاں ''انا کی لہروں'' کا قانون متعارف کرواتے ہیں۔ اطلاع نشر اور وصول کرنے کا تیز ترین طریقہ انا کی لہروں پر مبنی ہے۔

شیخ عظیمی فرماتے ہیں:

''دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انا کی لہریں کام کرتی ہیں۔ درخت آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ دور دراز درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹی کے ذرّوں میں من وعن اسی طرح تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔''

حشرات اور عقل و شعور: حشرات اپنی جسامت میں جتنے چھوٹے ہیں، عقل و شعور اور فہم و فراست میں اتنے بڑے ہیں۔ تعمیرات، انجینیرنگ، باغ بانی، طب، کان کنی غرض ہر وہ شعبہ جس پر نوع آدم نازاں ہے، حشرات الارض ان شعبوں میں آدمی سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ واضح مثال یہ ہے کہ آدمی نے حشرات کے طریقہ کار سے سیکھا ہے اور اسے اپنے انداز میں نقل کیا ہے۔ روبوٹکس میں حشرات اور ان کی کارکردگی کی ہر حوالہ سے نقل کی کوشش کی جاتی ہے۔ ائیر کنڈیشننگ کے نظام سے یہ مخلوق اپنے باوا آدم کے زمانہ سے واقف ہے۔ اسی طرح لاسلکی نظام کے تحت ابلاغ اور برقی مقناطیسی پیغام رسانی حشرات الارض میں فطری طور پر موجود (built-in) ہے جب کہ نوع آدم میں موبائل فون کی ایجاد کو عقل کا عظیم کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

کتاب ''قلندر شعور'' میں چیونٹیوں کی کئی اقسام اور ان کی صلاحیت بیان کی گئی ہے۔ ان میں چند کا مختصراً ذکر پیش خدمت ہے۔

باغ بان چیونٹیاں: چیونٹیوں کی ایک قسم باغ بان ہے۔ یہ پھپھوند کے باغات لگاتی ہیں اور کمال مہارت

سے باغوں کی افزائش کرتی ہیں۔ باغ مکان کی گیلریوں اور خانوں میں بنائے جاتے ہیں۔ چیونٹیوں کے لئے ان کی حیثیت پھولوں کے باغ کی ہے۔ چیونٹیاں ان باغات کو بطور غذا استعمال کرتی ہیں اور آبادی کے تمام افراد اس غذا سے مستفید ہوتے ہیں۔

انجینیئر چیونٹیاں: انجینیئر چیونٹیاں ہنر مندی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بڑا کمرا تعمیر کرتی ہیں جو شاہی محل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ملکہ قیام کرتی ہے۔ مزدور اور کارکن ملکہ کی خدمت گزاری میں مصروف رہتے ہیں۔ شاہی محل گیلریوں کے ذریعے ہر طرف ملا ہوتا ہے۔ گیلریوں میں غذا کو ذخیرہ کرنے کے لئے جگہ جگہ عام خانے ہوتے ہیں۔ بعض خانوں میں مزدور کارکن رہتے ہیں۔ قلعہ کی بناوٹ اس طرز پر کی جاتی ہے کہ پانی اور تپش سے محفوظ رہے۔

فوجی چیونٹیاں: زیادہ تر خانہ بدوش ہوتی ہیں، طور طریقے فوجیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جس طرح فوجی کیمپ اور جنگلوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اسی طرح کا طرز رہائش ان کا ہے۔ قافلہ کی شکل میں سفر کرتی ہیں۔ ملکہ مصاحبین کے وسط میں ہوتی ہے۔ جو کیڑا راستہ میں حائل ہوتا ہے، محافظ چیونٹیاں اسے ہلاک کر دیتی ہیں۔ دن بھر سفر کے بعد رات کے وقت کسی درخت پر ستون کی شکل میں جمع ہو جاتی ہیں۔

ان کے جمع ہونے کا انداز دل چسپ ہے۔ اکٹھے ہوتے وقت یہ گیلریوں کی طرح درمیان میں راستہ چھوڑتی جاتی ہیں تاکہ ہوا کا گزر ہو۔ گویا شخص کے سائنسی اصولوں سے واقف ہیں۔ رات میں آرام کرتی ہیں۔ سورج طلوع ہوتے ہی پہلے ایک درجن چیونٹیاں علیحدہ ہو جاتی ہیں، اس طرح ایک کے بعد ایک قافلہ روانہ ہوتا ہے۔

کائنات میں چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی ہر تخلیق اللہ کی صناعی کا مظہر ہے۔ جو لوگ دن رات اللہ کی صناعی میں غور و فکر کرتے ہیں، ان کا مشاہدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شے بے مقصد پیدا نہیں کی۔

حشرات کی ایک قسم ایسی ہے جسے میت کی خبر ہو جاتی ہے اور وہ فوراً اس کے اندر گھر بنانے پہنچ جاتی ہے۔ ڈیڈ باڈی میں انڈے دیتی ہے، انڈے کیڑے بنتے ہیں اور کیڑے مٹی کے وجود کو ذرات میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ فرد کی موت کس وقت واقع ہوئی، متعلقہ ماہرین جاننے کے لئے انہی حشرات کی مدد لیتے ہیں۔ وہ مردہ جسم سے کیڑے اٹھاتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ سب سے بڑا نمونہ لیا جائے۔ کیڑے کی نشوونما کی اسٹیج کو دیکھتے ہوئے فرد کے مرنے کے وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ ماہرین کیڑے کی افزائش سے کیڑے کی عمر کا تعین کرتے ہیں اور اس کی مدد سے یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فرد کی موت کس درجہ حرارت میں واقع ہوئی۔

خالدہ زبیر

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو قرآن پاک میں غیب فرمایا ہے وہ آدمی کا غیب ہے، اللہ کا غیب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اللہ کے لئے غیب نہیں ہے تو اللہ کے لئے حضور ہے۔ جو اللہ کا حضور ہے وہ حقیقت ہے جو آدمی پر منکشف نہیں ہے اس لئے جو آدمی کا مشاہدہ ہے، وہ حقیقت نہیں ہے۔

''اور بے شک ہم نے بنائے آسمان میں بہت سے بروج اور آراستہ کر دیا انہیں دیکھنے والوں کے لئے۔'' (الحجر:۱۶)

جنت میں حضرت آدمؑ پر خوشی کے حواس کا غلبہ تھا، وہ خوف وغم سے آزاد تھے۔ نظر ہر شے کا نظارہ کرتی۔ لامحدود جنت ان کے تصرف میں تھی۔ نافرمانی سرزد ہوئی اور نگاہ محدود ہوگئی۔ نظارے چھپ گئے۔ خوشی پس پردہ چلی گئی۔ خوف غالب آگیا اور زندگی کانٹوں بھری سیج بن گئی۔

اب نوع آدم کا حال یہ ہے کہ سامنے کھڑے ہوں تو پیچھے نظر نہیں آتا، پیچھے دیکھیں تو آگے پردہ آجاتا ہے۔ اوپر دیکھیں تو نیچے کا منظر غائب، نیچے دیکھیں تو اوپر کی اسپیس اوجھل۔ نافرمانی کے سبب شک پیدا ہوا، شک نے خوف کو جنم دیا اور خوف نے ذہن تقسیم کر دیا— نظر ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

نافرمانی کے بعد آدم کی جنت کو دیکھنے کی صلاحیت مغلوب ہوگئی۔ کائنات میں جتنے مناظر ہیں، سب سامنے موجود ہیں لیکن زمین کے حواس غالب ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتے۔ زمین کے حواس کیا ہیں—؟

اللہ تعالیٰ نے ہر شے نور سے پیدا کی ہے۔ جنت میں نور غالب اور رنگ مغلوب ہیں۔ زمین پر نور مغلوب اور رنگ غالب ہیں۔ رنگوں کی فطرت تبدیل ہونا ہے۔ جو شے تبدیل ہوتی ہے اس کو اصل سمجھنا خود کو حقیقت سے دور کر لینا ہے۔

''کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو، اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہے؟ اور ہم اس کی بندگی کرنے والے ہیں۔'' (البقرۃ:۱۳۸)

جنت میں کام کرنے والی نظر زمین پر رنگوں میں تقسیم ہوگئی۔ تقسیم نے سوچ کو محدود کر دیا اور زندگی تلخی بن گئی۔ وہ نظر جو بروج کے مشاہدہ کے لئے تھی دنیا کے جھمیلوں میں الجھ گئی۔ لہٰذا محدودیت سے متاثر ذہن کا دیکھنا، سننا اور بولنا محدود ہوگیا۔

''ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہ غفلت میں پڑے ہیں۔'' (الاعراف: ۱۷۹)

''اے انسان، کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا۔'' (الانفطار:۶)

آنکھ عدسوں پر مشتمل ہے۔ آنکھ کی اوپری سطح پر موجود عدسہ کو محققین نے محدب عدسہ (convex lense) کا نام دیا ہے۔ یہ لینس دماغ کے اندر بننے والی شبیہ کو الٹا دیکھتا ہے۔ شبیہ جب پوزیٹو بن کر ظاہر ہوتی ہے تو سیدھی نظر آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ نگاہ نے پہلے الٹا کیوں دیکھا؟ الٹا دیکھنے کا عمل اصل ہے یا الٹی نظر آنے والی شبیہ کو سیدھا دیکھنا اصل ہے؟ یا پھر الٹا اور سیدھا نظر آنے کے علاوہ شبیہ کی کوئی حقیقت ہے؟

سائنس کے مطابق شے کی روشنی آنکھ میں داخل ہوتی ہے تو ذہن پر عکس بنتا ہے۔ ذہن یادداشت کے مطابق اس کو دماغ کے الٹے حصے پر دیکھتا ہے اور جو دیکھا اس کی اطلاع فراہم کرتا ہے۔ نتیجہ میں ہم ذہن پر ابھرنے والے نقش کو جو پہلے نیگیٹو تھا، پوزیٹو دیکھتے ہیں۔

آنکھ کی بناوٹ، عدسہ کی موٹائی اور جینیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے ہر فرد کے دیکھنے کا عمل یکساں نہیں۔ واضح مثال کلر بلائنڈ افراد ہیں جو مخصوص رنگوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہر فرد آنکھ کی ساخت کی مناسبت سے رنگ اور حجم میں فرق اور چیزوں کو قریب و بعید دیکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر شخص ایک چیز کو الگ دیکھتا ہے۔

مادی نگاہ کے دیکھنے میں اتنی تبدیلی ہے تو پھر ہم کیا دیکھ رہے ہیں اور کیا سمجھ رہے ہیں—؟

رنگی کو کہیں نارنگی، تنت مال کو کھویا
چلتی کو کہیں گاڑی، دیکھ کبیرا رویا

جو نظر رنگ کو بے رنگ، دودھ سے حاصل ہونے والی شے کو کھویا اور حرکت کرتی ہوئی چیز (سواری) کو گاڑی ہوئی شے کا نام دے، وہ قیاس ہے۔

محدود اور قیاس پر مشتمل نظر کے بارے میں ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں،

''اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں قیاس کو رد کیا ہے۔ جگہ جگہ فرمایا ہے: 'تم نہیں سمجھتے ایسا ہے، ایسا ہے اور تم نہیں دیکھتے'۔ ایک جگہ فرمایا ہے: 'تم دیکھتے ہو پہاڑ اور گمان کرتے ہو کہ یہ جمے ہوئے ہیں، یہ جمے ہوئے نہیں بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو قرآن پاک میں غیب فرمایا ہے وہ آدمی کا غیب ہے، اللہ کا غیب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اللہ کے لئے غیب نہیں ہے تو اللہ کے لئے حضور ہے۔ جو اللہ کا حضور ہے وہ حقیقت ہے جو آدمی پر منکشف نہیں ہے۔ اس لئے جو آدمی کا مشاہدہ ہے، وہ حقیقت نہیں ہے۔''

دیکھنے کے لئے آنکھ ضروری ہے اور آنکھ سب کے

پاس ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا آدمی واقعی آنکھ سے دیکھتا ہے؟ آنکھ تو نابینا شخص کی بھی ہوتی ہے، وہ کیوں نہیں دیکھتا؟ آنکھ ان کے پاس بھی ہے جن کو سامنے رکھی ہوئی چیز نظر نہیں آتی پھر یہ کس آنکھ کی بات ہے؟

آدمی دنیا میں آتا ہے تو اس پر ایک پرت ایسا غالب ہوجاتا ہے جس میں سرکشی، بغاوت، عدم تحفظ، عدم تعمیل، کفرانِ نعمت، ناشکری، جلد بازی، شک اور وسوسوں کا ہجوم ہے۔نافرمانی کا پرت دل پر چڑھتا ہے تو دل پر نقش حقیقی عکس کو نظر سے اوجھل کردیتا ہے۔ حقیقی نقش وہ ہے جو بصارت متحرک ہوتے وقت سب سے پہلے دل پر منعکس ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے یوم ازل میں مخلوقات کو اپنا دیدار کروایا تو ہر ذی روح نے خالق کا دیدار کیا۔سماعت، بصارت، گویائی، فہم اور حواس تمام مخلوق کو عطا ہوئے۔ مخلوق کو وہ حواس حاصل ہیں جن سے اللہ کا عرفان ہوتا ہے۔ایسے میں جب وہ دنیا میں آکر مظاہر کو دیکھتا ہے لیکن جس ہستی کے سبب اس کا اور ان سب اشیا کا وجود ہے، جس ہستی نے حواس عطا کئے، جس ہستی کے سبب حواس متحرک ہوئے وہ ہستی نظر نہیں آتی تو کیا آدمی کا دیکھنا معتبر ہے—؟

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اللہ کو دیکھنے والی آنکھ وہ نہیں ہے جو چہرہ پر موجود ہے، اللہ کو دیکھنے والی آنکھ وہ ہے جسے ''فواد'' کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تمہاری رگِ جاں سے زیادہ قریب ہوں، دل میں پیدا ہونے والے ہر خیال سے واقف ہوں۔مومن کا دل میرا گھر ہے۔

اس کے برعکس ہم دل کو کیا سمجھتے ہیں—؟

محض خون پمپ کرنے کی مشین!

سائنس کے مطابق دل مخروطی شکل کا ایسا عضو ہے جو اندر سے کھوکھلا (خلا) ہے۔یہ جسم کو خون فراہم کرتا ہے۔دل دو تہوں والی جھلی میں لپٹا ہوتا ہے جس کو ''پیری کارڈیم'' کہتے ہیں۔بیرونی جھلی پیرائٹل (جداری یعنی بیرونی دیوار) اور اندرونی وسیرل (احشائی یعنی داخلی) کہلاتی ہے۔ان تہوں کے درمیان مخصوص مائع ہوتا ہے جو پیری کارڈیل مائع کہلاتا ہے اور دل کو بیرونی جھٹکوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

دل منظّم طریقہ سے کام انجام دیتا ہے۔اس کے خلیات معین نظام کے تحت پھیلتے ہیں اور سکڑتے ہیں۔ دل ایک منٹ میں 72 مرتبہ دھڑکتا ہے اور زیادہ کام یا جوش کی صورت میں دھڑکن کی تعداد 100 ہوجاتی ہے۔پھیلنے اور سکڑنے کے عمل سے ایک دھڑکن بنتی ہے جو تقریباً 0.8 سیکنڈ میں مکمل ہوتی ہے۔دل کی دھڑکن اور سانس کا گہرا تعلق ہے۔

یہ دل کی سادہ اور مختصر سائنسی وضاحت ہے۔

دل کا باطنی رخ کیا ہے اور اس سے کیسے واقف

ہوں ــــ؟ دل کے باطنی رخ سے واقف ہونے کے لئے خیال کی تحریکات پر غور کرنے کے ساتھ گہرائی میں سانس لینا اہم ہے۔ گہرے سانس سے باطن میں قیام کا وقفہ بڑھتا ہے۔ نتیجہ میں دل کا روحانی کردار غالب ہو جاتا ہے کیوں کہ گہرائی میں جانا سانس کی صعودی حرکت ہے ــــ سانس جہاں سے آیا ہے، اس کا واپس وہاں جا کر قیام کرنا گہرائی میں سانس لینا ہے۔

روحانی آنکھ دیکھتی ہے کہ سکڑنے اور پھیلنے والا دل محض خول ہے۔ خول میں جہاں سے تحریک پیدا ہوتی ہے، وہ دل کا اصل مرکز ہے جس تک پہنچ کر بندہ کی آنکھ کھلتی ہے۔ حقیقی نگاہ کے حصول کے لئے قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے،

''اور اے نبیؐ! یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تمہیں حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔'' (ھود: ۱۲۰)

ہم ہر کام باطنی تحریک کے سبب کرتے ہیں۔ حرکت جسم کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے اس لئے ہم تحریک کا سبب جسم کو سمجھ لیتے ہیں۔ دل کے دیکھنے کو جسم سے منسوب کرنے سے نگاہ محدود ہو جاتی ہے۔

نگاہ نے جب پہلی بار خالق کو دیکھا تو یہ عکس دل کے آئینہ میں محفوظ ہو گیا۔ نافرمانی کے سبب دنیا میں آنے کے بعد دل کے آئینہ پر ناشکری اور محدود حواس کی گرد پڑنے سے روز ازل کا عکس دھندلا گیا ہے۔

فرد انکار نہیں کر سکتا کہ سب کچھ ہونے کے باوجود اندر میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ایک کسک اور کھوج ہے کہ جس کے ملنے سے سکون حاصل ہو جائے اور ہم خود کو مکمل محسوس کریں۔ کسک کو مادی چیزوں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نئی گاڑی خرید لی، کچھ دن خوش ہو گئے، تشنگی سے عارضی طور پر توجہ ہٹ گئی لیکن تشنگی موجود ہے۔ کچھ دنوں بعد گاڑی پرانی ہوئی اور ہم پھر وہاں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔

نور باطن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشنگی مادی چیزوں سے پوری نہیں ہوتی، اندر میں موجود تشنگی روز ازل کی کسک ہے۔ جب تک بندہ دنیا میں آنے کے بعد اللہ کو دیکھ نہیں لیتا، کسک موجود رہے گی۔

''وہ اللہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور اس نے بنائے تمہارے کان، آنکھیں اور دل۔ تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔'' (الملک: ۲۳)

باطن سے صرفِ نظر کر کے ظاہر کو دیکھنا الوژن (فریبِ نظر) میں گم ہونا ہے۔ ظاہر کی بنیاد یعنی باطن کو تلاش کرنا حقیقت ہے۔

ہر شے اندر سے باہر آتی ہے۔ باہر دیکھنے کے بجائے اگر اندر دیکھنا شروع کر دیں، دل کے آئینہ پر چھائی گرد دور ہو جائے گی۔

اقتباسات

''ماہنامہ قلندر شعور'' کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم وبیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

حسد خطرناک اخلاقی بیماری ہے جس سے دوسری بیماریوں کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ ''حسد اور ایمان ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ حسد سے بچو، حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔'' بے وقوف اور عقل مند دونوں اس کمزوری سے مبرا نہیں۔ جب عقل مند کی سوچ میں حسد پیدا ہو جائے تو اب اسے عقل مند کہنا غیر مناسب ہے کیوں کہ اس نے حسد کو اپنا کر بڑی بے وقوفی کی ہے۔ حاسد کبھی خوش نہیں ہوتا، وہ ہر وقت کسی نہ کسی سے جلتا رہتا ہے۔ (مرسلہ: شکیلہ۔ کراچی)

روح جانتی ہے کہ خالق کائنات کی مشیت کیا ہے۔ خالق کائنات کی مشیت اور منشا کے مطابق خود کو نئے نئے لباسوں میں ظاہر کرتی ہے اور ہر لباس کو اس کی موجودگی اور اس کی انا سے مطلع کرتی رہتی ہے۔ یہی وہ اطلاع (information) ہے جس کے اندر معانی پہنانا ''اختیار'' ہے۔ سزا ہو یا جزا دونوں کا تعلق اطلاع سے ہے اور اطلاع کا نزول روح کے تخلیق کردہ جسم پر ہوتا ہے۔ روح جزا و سزا، تکلیف و راحت سے مبرا ہے۔ (مرسلہ: دانش، کتاب: پیراسائیکالوجی)

انسان دراصل ایک درخت ہے اور اس کی زندگی کے اعمال و کردار اس درخت کے پھل ہیں۔ درخت اپنی جڑ سے نہیں اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی صورت حال انسانی اعمال کی ہے۔ صداقت کا فیصلہ ماخذ سے نہیں اس کے نتائج سے مرتب ہوتا ہے۔ انسان کا خود اپنا عمل اس کا یقین ہے کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ کسی عمل کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دیکھا جائے یہ عمل معاشرہ پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ اگر عمل میں سچائی، گہرائی اور فطرت موجود ہے تو عمل صحیح اور سچا ہے۔ (مرسلہ: فائقہ کلثوم۔ پھالیہ، کتاب: کشکول)

اقتدار احمد خان

غربت، امارت ــــ غربت

ماں نے ساری زندگی محنت کو شعار بنایا تھا اس لئے بیٹوں کو ہدایت کی کہ ہمیشہ دیانت داری سے کام کریں اور پیسوں کی چکاچوند میں غلط راستہ کا انتخاب ہرگز نہ کریں۔ کل تک ماں کے آگے سر جھکانے والے بیٹوں نے آج سرسری طور پر ماں کی نصیحت سنی۔

سب سے زیادہ ذہنی اذیت یہ تھی کہ مدثر اسٹیشنری والا ان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ صبح گھر سے نکلتے ہوئے، واپسی پر شام کو گلی میں داخل ہوتے وقت حتیٰ کہ مسجد میں عین ان کے پیچھے والی صف میں چہرہ پر چاپلوس مسکراہٹ سجائے بیٹھا ہوا ملتا۔ راستہ میں جہاں ملاقات ہوتی، ان کے ساتھ چلنا شروع کر دیتا۔ حال احوال پوچھتا، موسم اور حالات حاضرہ پر تبصرے کرتا۔ یہ سب ان کے لئے سخت کوفت کا باعث بن گیا تھا مگر وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

انہیں موسم اور حالات حاضرہ کی باتوں سے کوفت نہیں ہوتی تھی، وہ تو خود ان باتوں کے رسیا تھے اور گھنٹوں ان موضوعات پر بے تکان گفتگو کرتے تھے۔ مگر یہاں معاملہ اور تھا۔

دراصل مدثر اسٹیشنری والا ان باتوں کو ایک آڑ کے طور پر استعمال کرتا۔ جیسے ہی مخاطب اس کی باتوں میں آتا وہ ماہر شکاری کی طرح نشانہ بناتا اور مخاطب کو زیر کرنے کی کوشش کرتا۔ لوگ زچ ہو جاتے۔

مدثر اسٹیشنری والے سے پہلے ضروری ہے کہ ان صاحب کا تعارف ہو جائے جو اس کا اگلا شکار بننے والے تھے اور مضمون کا مرکزی کردار ہیں۔ یہ حبیب صاحب ہیں۔ غریب گھرانہ میں آنکھ کھولی، مفلسی اور بے چارگی میں زندگی بسر کی۔ جب چھوٹے تھے تو والد کا انتقال ہو گیا۔ رہنے کے لئے گھر کے نام پر تنگ و تاریک کوٹھری۔ بھائی بہنوں اور والدہ کا ساتھ تھا۔ ایک بہن بچپن میں جعلی عامل سے جن اتروا تے ہوئے موت کے گھاٹ اتر گئی۔ دوسری بہن جعلی عاملوں سے محفوظ رہی حالاں کہ دورے اسے بھی پڑتے تھے۔

حبیب صاحب کی والدہ خوددار اور محنتی خاتون تھیں۔ بیٹے کو ورثہ میں باپ سے غربت اور ماں سے محنت کا جذبہ ملا۔ ورثہ میں ملنے والی زمین (غربت) میں ماں کے دیئے ہوئے بیج (محنت) بونے شروع کئے اور پھر کسی کام کو عیب نہ جانا۔ بوریاں اٹھائیں، فجر سے پہلے

سبزی منڈی میں سبزیاں دھوئیں، کہیں گھر اور دکان کی تعمیر ہوتی تو خود کو مزدوری کے لئے پیش کر دیتے۔ ٹرک کے اڈے پر مال چڑھانے اور اتارنے کا کام کیا۔ ہر وہ کام جو زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے کے لئے کیا جا سکتا تھا، حبیب صاحب نے کیا۔

محنت اور ایمان داری کا ثمر ملنا شروع ہوا، لوگوں سے جان پہچان بڑھی اور پھر ایک روز بڑی گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کے ڈیلر کریم شیخ سے رابطہ ہو گیا۔ اسے حبیب صاحب جیسے محنتی اور قابل اعتماد ملازم کی تلاش تھی۔ کریم شیخ کی ہائی وے پر دکان تھی۔ ہائی وے پر بھاری ٹریفک دور دراز سفر کے لئے رواں دواں رہتی۔ کاروبار کامیابی سے دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا مگر پھیلتے ہوئے کاروبار کو سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ اولاد نا اہل تھی، کام کرنے کا شوق نہیں تھا۔ بیٹا جس روز دکان پر بیٹھتا تو کام پر توجہ دینے کے بجائے شیخیاں بگھارتا۔

ملازموں کی کارکردگی بھی غیر اطمینان بخش تھی۔ بعض ملازم دکان سے قیمتی پرزے چرا کر باہر آدھی قیمت پر فروخت کر دیتے۔

اس صورت حال میں جب کریم صاحب کی نظر حبیب صاحب اور ان کے بھائی پر پڑی تو تجربہ نے ہیرے کو پہلی نظر میں شناخت کر لیا۔ قصہ مختصر حبیب صاحب کو کام کی پیش کش کی گئی جو دونوں بھائیوں کے لئے نعمت سے کم نہیں تھی۔ بیٹوں نے ماں سے مشورہ کیا۔ ماں نے دعا اور اجازت دونوں سے نوازا۔

اس سے قبل جو محنت مختلف جگہوں پر لگتی تھی اب ایک جگہ رنگ جمانا شروع ہو گئی۔ کریم صاحب کا کاروبار مزید پھیلا۔ وقت گزرنے کے ساتھ کریم صاحب کی نئے ملازموں سے قربت بڑھی۔ ان کی شفقت اور سرپرستی میں دونوں بھائیوں نے چھوٹے پیمانہ پر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

محنت اور ایمان داری کا فطری نتیجہ ترقی ہے مگر ترقی کے نتیجہ میں پیسے کی فراوانی نے بھائیوں کے مزاج بدل دیئے۔ لوگ حیران تھے کہ محنت سے حاصل کئے گئے مقام کی قدر کی جاتی ہے لیکن دونوں بھائی مشقت کے دن بھول گئے اور پرانے جاننے والوں سے آنکھیں پھیر لیں۔ بھائیوں نے دھوم دھام سے بہن کی شادی کی۔ ماں بیٹوں کے لئے بڑے گھروں سے دلہنیں لائی۔ گھر میں بچوں کی کلکاریوں کی میٹھی آواز گونجتی۔ خوش حالی کے دن آ گئے۔

ماں نے ساری زندگی محنت کو شعار بنایا تھا اس لئے بیٹوں کو ہدایت کی کہ ہمیشہ دیانت داری سے کام کریں اور پیسوں کی چکاچوند میں غلط راستہ کا انتخاب ہرگز نہ کریں۔ کل تک ماں کے آگے سر جھکانے والے بیٹوں نے آج سرسری طور پر ماں کی نصیحت سنی۔ ماں نے رویوں میں تبدیلی کو جانچ لیا اور خاموش ہو گئی البتہ بیٹوں کے لئے دعا ضرور کرتی۔

حبیب صاحب نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، وہ مٹی سے سونا ہوگیا۔ ہر طرف سے پیسوں کی برسات ہونے لگی۔ نئے دوست بنے جن میں سے ایک نے جُوا خانہ کی راہ دکھائی۔ جُوا کھیلنے لگے تو دوسرے جواریوں کی جیبیں خالی کرنا شروع کردیں۔ گھر میں آنے والا رزق مقدار میں بڑھ گیا مگر حلال نہیں رہا، نجاست شامل ہوگئی اور کاروبار میں سے برکت ختم ہوگئی۔ غربت کے دنوں میں حقارت سے دیکھنے والی نظریں ان کے راستوں میں بچھنے لگیں۔

ماں نے بیٹوں کو غلط راستہ پر چلنے سے روکا اور نتائج سے خبردار کیا لیکن ان کی آنکھوں پر امارت کی پٹی بندھ گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے محسن کریم شیخ کو بھول گئے۔ غربت سے امارت کا سفر جو پہلے پہل ایمان داری سے طے کیا گیا تھا، اس میں جُوے کے پیسوں کی شکل میں شوق آوارگی کی آمیزش سے جو جوشاندہ بھائیوں نے تیار کیا، وہ بہرحال ان کو پینا تھا۔

حبیب صاحب کی ہائی وے پر بڑی دکان تھی، انتظامیہ نے چند سالوں بعد ہائی وے کی توسیع کا فیصلہ کیا۔ بھائیوں کی دکان زد میں آئی۔ انتظامیہ نے دکان کے بدلے پیسے ادا کئے لیکن نئی جگہ پر دکان ویسے نہیں چلی جو عالم پرانے کاروباری مرکز کا تھا۔ جو زوال برسوں میں آتا ہے، وہ نئی نویلی ہائی وے پر بڑی تیزی سے سفر کرتا ہوا دنوں میں آپہنچا۔ صدمہ برداشت نہ ہوا تو حبیب صاحب غم غلط کرنے کے لئے نشہ کرنے لگے۔ ذہن ماؤف ہونا شروع ہوا، جُوے میں چال بھول کر دوسرے جواریوں کے جال میں آجاتے۔ ہر ہارنے والے جواری کی طرح وہ اگلی بازی جیتنے کے لئے ایک بار پھر بازی لگاتے اور یوں لٹتے چلے گئے۔ ان پر دن بہ دن قرض بڑھ رہا تھا، لوگوں کا اور وقت کا بھی۔

ماں کی وفات کو کئی سال ہوگئے تھے۔ اگر اس نے بیٹوں کی یہ حالت دیکھی ہوتی تو صدمہ سے پہلے ہی مرجاتی۔ حبیب صاحب جب کبھی ہوش میں ہوتے تو ماں کی باتیں یاد آتی تھیں۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا، وقت نے بازی پلٹ دی تھی۔

اس منظر میں چرب زبان مدثر اسٹیشنری والا داخل ہوتا ہے، اس کی اسٹیشنری کی دکان تھی، دراصل وہ دکان نہیں، دفتر تھا جہاں وہ آس پاس دکانوں اور مکانات پر نظر رکھتا۔ جیسے ہی کوئی اپنا گھر بیچنا چاہتا، وہ خدمات پیش کردیتا۔ اس وجہ سے وہ فروخت کرنے اور خریدنے والوں کی تاک میں رہتا تھا اور لوگ مجبوراً اسے برداشت کرتے تھے۔

جو لوگ گھر خریدنے آتے وہ مدثر اسٹیشنری والے کے توسط سے آتے جنہیں وہ پہلے ہی گھر والوں کی مجبوری کی داستان سنا دیتا۔ پھر خریدار گھر نہیں خریدتا تھا بیچنے والے کی مجبوری خریدتا تھا اور ظاہر ہے مجبوری

سستا سودا ہوتی ہے۔

حبیب صاحب نے جو گھر بہت ارمان سے بنایا تھا، جس کے دروازے، کھڑکیاں، روشن دان، فرنیچر، فانوس، پردے اور پودے کتنی سوچ بچار اور بحث و مباحثہ کے بعد گھر کی زینت بنے تھے، اب وہ گھر نئے مکین کا منتظر تھا۔ جس گھر سے بیٹی کی ڈولی رخصت ہوئی تھی، جہاں بیٹوں کی دلہنیں آئی تھیں، جس کے آنگن میں حبیب صاحب نے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کے ساتھ کھیلا تھا وہ گھر اپنی غلطیوں کے سبب انہوں نے کھو دیا۔

بات صرف گھر کی نہیں، غفلت کی تھی۔ جن کے پاس غربت ہوتی ہے، وہ امیری کو ترستے ہیں اور جب امیری آتی ہے تو بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ پس ماندہ علاقہ کے جس گھر کو چھوڑ کر وہ یہاں آئے تھے، آج اس علاقہ میں ان کی دوبارہ واپسی تھی۔

محنت کر کے ترقی کرنے والے ہر فرد کا مقدر ایک سا نہیں ہوتا— جو لوگ محنت کے دن بھول جاتے ہیں او رنعمتوں کی قدر نہیں کرتے، ان کا حال حبیب صاحب جیسے لوگوں کی طرح ہوتا ہے۔

رات کے اندھیرے میں دو ٹرک آئے، ضروری سامان لادا گیا، باقی چھوڑ دیا گیا۔ صبح محلے والوں نے دیکھا کہ جس گھر میں ہر وقت رونق لگی رہتی تھی، آج اس کے دروازہ پر بھاری تالا لگا ہوا تھا۔

درطریق عشق بیداری بداست

مولانا رومؒ ایک حکایت میں فرماتے ہیں،

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی
کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

ایک بار خلیفہ بغداد نے لیلیٰ سے کہا، تو سیاہ رنگ ہے پھر بھی مجنوں تیرے عشق میں دیوانہ ہے۔

از دگر خوباں تو افزوں نیستی
گفت خامش! چوں تو مجنوں نیستی

حسین عورتوں کے مقابلہ میں تجھ میں امتیازی صفت نہیں۔ پھر مجنوں کیوں تیرا دیوانہ ہے؟

لیلیٰ نے جواب دیا، اے خلیفہ! خاموش رہ! تو نے یہ بات اس لئے کی کہ تو مجنوں نہیں۔

دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا
ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

اگر تجھے مجنوں کی نظر حاصل ہو تو دنیا وی چکا چوند تیری نظر میں ہیچ ہو جائے۔

باخودی تو لیک مجنوں بے خود است
در طریق عشق بیداری بداست

اے خلیفہ! تو ہوش میں ہے لیکن مجنوں کو میرے عشق نے بے خودی عطا کی ہے۔ راہِ عشق میں بے خودی مفید اور ہوش مضر ہے۔

ہر کہ بیدارست او در خواب تر
ہست بیداریش از خوابش بتر

خود کو بیدار سمجھنے والا دراصل غفلت میں ہے۔ ایسی غفلت سے وہ نیند بہتر ہے جس سے تو واقف نہیں!

محمد سعید انور

لیموں

ہر موسم کا پھل خوبیوں سے بھرپور ہے لیکن سٹرس (citrus) فیملی کے ایک رکن میں ایسی افادیت ہے جو کسی اور پھل کو نصیب نہیں۔ جی ہاں لیموں موسموں کی قید سے آزاد ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔

لیموں میں موجود تین اجزا سٹرک ایسڈ، اسکاربک ایسڈ (وٹامن سی) اور فائبر اسے صحت کے لئے امرت بناتے ہیں۔ کیلشیم اور فاسفورس بھی مناسب مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔

برصغیر کے حکما نے نظام ہضم کی خرابیوں کے لئے صدیوں سے لیموں کو بطور دوا استعمال کیا ہے۔ بدہضمی، متلی، قے، سر چکرانے اور معدہ میں تیزابیت کے لئے ایک چمچ لیموں کا رس اور شہد ملا کر کھانے سے فوری افاقہ ہوتا ہے۔ تیزابیت زیادہ ہو تو ایک گلاس پانی میں ایک لیموں نچوڑیں۔ اس میں چوتھائی چمچ چائے کا یا حسب ضرورت میٹھا سوڈا (سوڈا بائی کاربونیٹ) ملا کر پی لیں، تیزابیت رفع ہوتی ہے۔

بھوک نہ لگنے کی صورت میں نظام ہضم کو تحریک اور تقویت دینے کے لئے لیموں کا استعمال مفید ہے۔ اس مقصد کے لئے لیموں کا اچار استعمال کیجئے۔ لیموں کا رس ایک گلاس نیم گرم پانی میں نچوڑ کر بھی پی سکتے ہیں۔ صفرا (زرد رنگ، حرارت کی زیادتی) کے مرض میں کمی ہوتی ہے، قبض ٹوٹتا ہے اور دل کے لئے بھی مفید ہے۔

بعض اوقات نظام ہضم میں خرابی کی وجہ سے منہ سے بدبو آنا آپ کو محفل میں شرمندہ کر دیتا ہے۔ لہسن، پیاز یا مچھلی کھانے کے بعد بھی منہ سے بدبو آتی ہے۔ کھانے کے ایک گھنٹہ بعد ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر پی لیں، منہ سے بدبو آنا رک جائے گی۔

لیموں نظام بول کے لئے بہت مفید ہے۔ اس میں پایا جانے والا سٹرک ایسڈ گردہ کی پتھری نکالنے میں مددگار ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پیشاب کے پیلے پن اور تیزابیت کو ختم کرتا ہے۔ یہ پیشاب آور ہے اس لئے جسم سے فاسد مادوں کو نکال دیتا ہے۔

لیموں کولیسٹرول کو کم کرتا ہے۔ ہارٹ اٹیک کے خطرہ اور دیگر امراض قلب سے محفوظ رکھتا ہے۔ لو بلڈ پریشر میں مفید ہے۔ یہ تمام خوبیاں لیموں میں وٹامن سی کی وجہ سے پائی جاتی ہیں۔ بالغ شخص کو روزانہ 65 تا 90 ملی گرام وٹامن سی کی ضرورت ہوتی ہے، لیموں کے جوس کا ایک گلاس 18.6 ملی گرام وٹامن سی مہیا کرتا ہے۔

زائدوزن سے پریشان لوگوں کے لئے محفوظ طریقہ سے وزن کم کرنا ایک مسئلہ ہے۔ صبح نہار منہ لیموں اور نیم گرم پانی دیگر فوائد کے ساتھ وزن کی کمی میں مددگار رہے۔

صفراوی بخار میں پیاس زیادہ تنگ کرے، بدن میں گرمی اور جلن ہو تو لیموں کا پانی (سکنجین) مفید ہے۔ صفراوی بخار میں قے اور متلی ہو تو لیموں کے ٹکڑے پر نمک چھڑک کر چٹانے سے شکایت دور ہو جاتی ہے۔

ﷺ

موسم گرما میں لیموں نعمت سے کم نہیں۔ گرمی کی شدت سے نڈھال ہوں، پسینہ زیادہ بہہ جانے کے باعث جسم میں نمکیات، الیکٹرولائٹ، پوٹاشیم، کیلشیم وغیرہ کم ہو جائیں تو ایک گلاس پانی میں ایک لیموں نچوڑیں اور ایک چمچ خالص شہد شامل کر کے پی لیں، جسم میں توانائی دوڑ جائے گی۔

ہم پھلوں یا سبزیوں کے چھلکوں کو غیر اہم سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ چھلکے اکثر اوقات پھل یا سبزی میں پائے جانے والے قیمتی اجزا کے مقابلہ میں زیادہ افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چھلکوں کو ضائع کر کے ہم قیمتی اجزا اور غذائیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح کا معاملہ لیموں کے چھلکے کے ساتھ ہے۔ لیموں کا رس خوبیوں کا حامل ہے، اس کا چھلکا بھی فوائد رکھتا ہے۔ یہ قوت مدافعت کو بڑھاتا اور کولیسٹرول کم کرتا ہے۔ کئی اقسام کے انفیکشن اور کینسر سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہاتھوں پر سے جراثیم کا خاتمہ کرتا ہے۔ باقاعدہ استعمال سے ذہنی دباؤ اور تناؤ میں کمی آتی ہے۔ چھلکوں میں وٹامن سی اور کیلشیم کی وافر مقدار ہوتی ہے جو ہڈیوں کو مضبوط کرنے کے کام آتی ہے۔ چھلکوں میں غذائی فائبر کی وافر مقدار قبض کے مسئلہ کو حل کرتی ہے۔

ﷺ

حسن کی حفاظت کے لئے لیموں مؤثر ہے۔ اس کا چھلکا اور رس دونوں رنگت میں نکھار کے لئے مفید ہیں۔

★ گرمیوں میں سورج کی تپش اچھے بھلے رنگ کو ماند کر دیتی ہے، ایسے میں لیموں کے چھلکے کو سکھا کر عرق گلاب کے ساتھ باریک پیس لیں۔ اس لیپ کو چہرہ پر ملنے سے نہ صرف رنگ صاف ہو جاتا ہے بلکہ کیل مہاسے اور جھائیاں دور ہو جاتی ہیں۔

★ چائے بنانے کے بعد کیتلی میں بچ جانے والی پتی میں دو لیٹر پانی ڈال کر ابالیں اور اس میں ایک لیموں کا رس نچوڑ لیں، پھر اس پانی سے سر دھو لیں۔ اس سے بالوں میں چمک آئے گی۔

★ چند قطرے لیموں کا رس آملہ کے عرق کے ساتھ روزانہ رات کو سونے سے پہلے بالوں میں لگانا بالوں کو گرنے سے روکتا ہے، بال لمبے ہوتے ہیں اور وقت سے پہلے سفید ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ خشکی اور سکری کا بھی مؤثر علاج ہے۔

★ ماہرین کہتے ہیں کہ لیموں کے پانی (جوس) سے آپ فریج کو اندر سے صاف کر کے اس کی بدبو کو

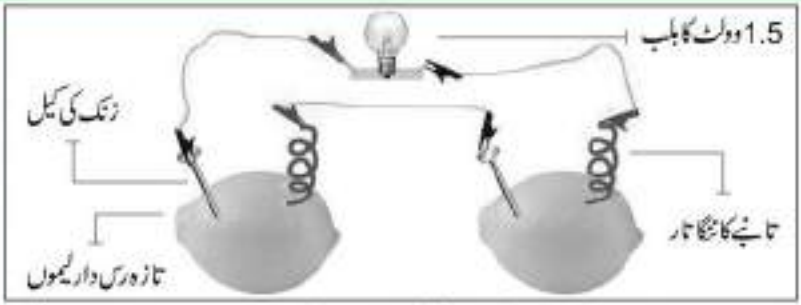

خوش بو میں بدل سکتے ہیں۔ طریقہ کار بھی انتہائی آسان ہے۔ لیموں کے جوس کو روئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ڈال کر انہیں گیلا کریں اور فریج کو اندر سے صاف کریں۔

★ خواتین ناخنوں کو چمک دار بنانے کے لئے عموماً لیموں کا رس استعمال کرتی ہیں۔ اس طرح اس کا ایک استعمال ناخنوں میں چمک پیدا کرنا اور انہیں خوب صورت بناتا ہے۔

گرمیوں میں نمکیات عام دنوں سے زیادہ خارج ہونے کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی ہوجاتی ہے۔ پیاس کی شدت سے بار بار پانی کی خواہش ہوتی ہے۔ گرمی کے اثر کو کم کرنے کے لئے مختلف رنگوں اور ذائقوں پر مشتمل لال پیلے شربت پیے جاتے ہیں۔ ان سب کے مقابلہ میں لیموں کا شربت جسے مقامی طور پر سکنجبین کہتے ہیں، کہیں زیادہ موثر اور فرحت بخش ہے۔ سکنجبین کی افادیت اور مقبولیت کے سبب مختلف کمپنیاں لیمن اسکواش، لیموں پانی (لیموں کا ست) فروخت کرتی ہیں جو استعمال میں تو سہل ہے لیکن سکنجبین کے فوائد سے کوسوں دور ہے۔ اس لئے ہمیشہ تازہ لیموں سے گھر پر لیموں پانی بنائیے۔

لیموں کی بیٹری بنانے کا تجربہ:

(ثانوی اسکول کے طلباء وطالبات کے لئے)

دو تازہ رس دار لیموں لیں۔ ہر ایک میں چاقو سے آدھا انچ گہرے دو کٹ لگائیں۔

دونوں کٹ قریب قریب ہونے چاہئیں۔

تانبے کا ننگا تار — چار چار انچ کے دو ٹکڑے لے کر تصویر کے مطابق spiral بنالیں اور ہر لیموں میں ایک کٹ میں یہ تار اور دوسرے کٹ میں ایک زنک کی کیل لگا دیں۔ ایک لیموں کے تار کو دوسرے لیموں کی کیل سے سادہ بجلی کے تار سے متصل کر دیں اور دوسرے جوڑے کے درمیان ایک ڈیڑھ وولٹ (1.5 V) کا بلب ہولڈر کے ساتھ فکس کر دیں۔ بلب روشن ہوجائے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ لیموں کے اندر مثبت اور منفی دونوں چارج موجود ہیں اور انہیں ملا کر ایک بیٹری سیل کی شکل دی جاسکتی ہے۔

عید کے کپڑے

تاثرات چھپانے کی کوشش میں اس نے چارپائیوں پر تیزی سے بستر بچھائے۔اس سے پہلے کہ وہ اندر جاتی،حمیرا کی آواز نے قدم روک لئے۔اماں ہرعید پر محلّہ کے بچے پرانے کپڑے پہننے پر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں،اس بار ہمیں نئے کپڑے چاہئیں۔

گلی میں گہما گہمی سے تصدیق ہوگئی کہ رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے اور کل پہلا روزہ ہے۔چھت سے حمیرا اور حمزہ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ پرجوش لہجہ میں امی کو آواز دے کر چاند نظر آنے کی خبر دے رہے تھے۔طیبہ باورچی خانہ میں تھی۔آواز سنتے ہی چاول دم پر رکھے اور آنچ دھیمی کر کے چھت پر گئی۔آس پڑوس میں خواتین بچوں سمیت چاند دیکھنے کے لئے چھت پر آ گئی تھیں۔

کہتے ہیں کہ رمضان کا چاند دیکھ کر جو دعا کی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔طیبہ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو بچے قریب آ گئے اور انہوں نے بھی دعا کی۔اس کے بعد طیبہ نے بچوں کو گلے لگا کر رمضان کی مبارک باد دی۔ بچے لڑکپن کے دور میں داخل ہو گئے تھے لیکن ابھی بھی بچے تھے۔چاند کو دیکھ کر ان کی خوشی دیدنی تھی۔

حیدر کا تعلق معاشی طور پر کم زور گھرانے سے تھا۔ امی ابو کا انتقال ہو گیا تھا، دو بہنیں تھیں۔ گھر کی تمام ذمہ داری اس پر تھی۔عمر 18 سال تھی لیکن ہنر نہیں تھا اور نہ کوئی کام آتا تھا۔محلّہ کے ایک شخص نے حیدر کو دستانوں کی فیکٹری میں ملازمت دلوا دی جہاں وہ روزانہ سینکڑوں دستانے پیک کرتا۔تنخواہ معمولی تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔

حیدر نرم مزاج تھا،لوگوں کی مدد کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ وقت گزرا، بہنوں کی شادیاں کیں اور پھر بہنوں نے بھائی کا گھر بسایا اور طیبہ دلہن بن کر حیدر کے گھر آ گئی۔ طیبہ کے آنے سے حیدر کو غم گسار ساتھی مل گیا۔زندگی سادگی سے ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔

اللہ نے اولاد سے نوازا۔نعمت کے بعد گھر میں رحمت آئی اور یہ گھرانا مکمل ہو گیا۔حمزہ اور حمیرا سے گھر میں رونق ہو گئی تھی۔حیدر بچوں کے ساتھ بچہ بن کر دن بھر کی تھکن بھول جاتا۔طیبہ ضروریات زندگی کا دائرہ بڑھنے سے بعض اوقات پریشان ہو جاتی کیوں کہ وسائل کم تھے۔حمزہ اور حمیرا کی پیدائش کے بعد اخراجات نے تو

جیسے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہو۔ بچے بڑے ہو رہے تھے، مگر آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ماں باپ کی طرح بچے شاکر تھے۔ جو دیا کھالیا، جو پہنایا، پہن لیا۔ ہر عید پر محلّہ کے بچے نئے نئے لباس پہنتے۔ طیبہ عید کے روز بچوں کو پرانے مگر صاف ستھرے کپڑے پہنا کر، بالوں میں کنگھی کر کے تیار کرتی — دودھ میں پکی سویاں کھلاتی اور کھیلنے کے لئے باہر بھیج دیتی۔ تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد وہ گھر واپس آجاتے مگر اماں کو نہیں بتاتے تھے کہ باہر کیا ہوا۔ طیبہ ماں تھی، اندازہ ہو جاتا کہ دوسرے بچوں نے مذاق اڑایا ہے اسی لئے گھر آگئے ہیں۔ حمیرا اور حمزہ سوچتے تھے کہ وہ عید کب آئے گی جب وہ زرق برق نیا لباس پہنیں گے۔

حمزہ پندرہ سال کا ہوا اور حمیرا کی عمر تیرہ سال تھی۔ ایک بار پھر رمضان آیا، بچے خوشی سے پھولے نہ سمائے، رمضان کا چاند دیکھنے کے بعد طیبہ اور بچے چھت پر گئے۔ اللہ سے دعا کی کہ اس بار انہیں عید پر نئے کپڑے چاہئیں۔ بعد میں صحن میں چارپائیاں بچھاتے ہوئے اس نے بچوں سے پوچھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا دعا مانگی — ؟

حمیرا اور حمزہ نے یک زبان کہا، ''نئے کپڑے''۔

طیبہ کا چہرہ بجھ گیا۔ تاثرات چھپانے کی کوشش میں اس نے چارپائیوں پر تیزی سے بستر بچھائے۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر جاتی، حمیرا کی آواز نے قدم روک لئے۔ اماں ہر عید پر محلّہ کے بچے پرانے کپڑے پہننے پر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، اس بار ہمیں نئے کپڑے چاہئیں۔ طیبہ نے انہیں گلے لگایا اور دھیمے لہجہ میں انشاء اللہ کہتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بچے خوشی سے اسکول کے کام میں دوبارہ مگن ہو گئے لیکن طیبہ کے چہرہ پر فکر کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ انشاء اللہ کہنے کے باوجود اسے یقین نہیں تھا کہ بچوں کو عید پر نئے کپڑے مل جائیں گے۔

فیکٹری والے ہر سال رمضان کے پہلے عشرہ میں ملازمین کو عید کی تیاری کے لئے بونس دیتے تھے۔ معمولی رقم سے رمضان کے انتظامات ہو جاتے لیکن عید کے کپڑوں کے لئے پیسے نہیں بچتے تھے۔

حیدر گھر میں داخل ہوا، سحری کے لئے دہی کی تھیلی طیبہ کو دی۔ بیگم کے چہرہ پر فکرمندی نظر انداز کر کے بچوں کو پیار کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بچوں نے اعلان کیا کہ اس سال وہ بھی روزہ رکھیں گے۔ باپ نے خوشی کا اظہار کیا لیکن ماں کے چہرہ پر سنجیدگی برقرار تھی۔ بچے سو گئے تو پریشانی کی وجہ پوچھی۔ طیبہ نے بچوں کی فرمائش کے بارے میں بتایا۔ حیدر نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا اللہ پر یقین رکھو۔ پریشان ہو کر گھر کا ماحول خراب مت کیا کرو۔ حیدر جانتا تھا کہ بچوں نے کبھی کسی چیز کی ضد نہیں کی۔ اس بار ان کے لئے کپڑوں کا

انتظام ضرور ہونا چاہئے۔

اس نے طیبہ سے کہا کہ بونس کی رقم کو رمضان میں استعمال کرنے کے بجائے اس بار بچوں کے لئے کپڑے اور جوتے خرید لینا۔

پہلا عشرہ گزر گیا لیکن بونس کی رقم نہیں ملی۔ طیبہ نے پوچھا، کیا فیکٹری والوں کا بونس دینے کا ارادہ نہیں؟

فیکٹری والے کہتے ہیں کہ اس سال خسارہ ہوا ہے، شاید کچھ دنوں میں مل جائے۔ عید ہے بونس ضرور دیں گے تم فکر نہیں کرو۔ دوسرا عشرہ بھی گزر گیا۔ بچے ایک دو روز بعد پوچھ لیتے کہ اماں کپڑے خریدنے کب جائیں گے۔ طیبہ آج کل کا کہہ کر ٹال دیتی۔

عید سے تین روز قبل فیکٹری والوں نے ملازمین سے معذرت کر لی کہ اس سال نقصان کے باعث بونس نہیں دیا جا سکے گا۔

خبر سن کر حیدر کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ اب تک خود کو تسلی دے رہا تھا کہ بونس مل جائے گا۔ خبر سن کر بچوں کے چہرے سامنے آ گئے۔ پیسوں کا انتظام کیسے ہو۔ فیکٹری میں کام کرنے والے قریبی دوستوں سے بات کی مگر سب کے حالات حیدر سے مختلف نہیں تھے۔ گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ طیبہ کو کیسے بتائے گا۔ مایوسی طاری ہوئی تو تقدیر سے شکوہ کیا۔

افطاری کے وقت گھر پہنچا تو شوہر کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر بیوی سمجھ گئی کہ بونس نہیں ملے گا۔ اذان ہوتے ہی روزہ کھولا۔ افطاری کرتے ہوئے بچوں نے ابا کو بتایا کہ تین دن بعد عید ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ماں باپ نہیں چاہتے تھے کہ چمک ماند ہو جائے لیکن وہ مجبور تھے۔ باپ نے انجان بننے اور ماں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ بچوں نے تبدیلی کو محسوس کیا اور خاموش ہو گئے۔

حیدر کے اندر طوفان برپا تھا۔ بچوں کو پیار کیا اور کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا۔ طیبہ نے حیدر کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کیا، مگر وہ کیا کر سکتی تھی— سوائے حیدر کا انتظار کرنے کے۔

کیا بچے اس بار بھی عید پر نئے کپڑے نہیں پہنیں گے—؟ مسجد کی طرف جاتے ہوئے بدگمان ہو کر سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے جس حال میں رکھا میں نے شکوہ نہیں کیا۔ محنت کی اور عزت سے گزر بسر ہوتی رہی۔ جب اللہ ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا ہے تو ہماری کیوں نہیں—؟ نماز پڑھی اور دعا مانگے بغیر گھر آ گیا۔ بیوی نے تسلی دی کہ میں بچوں کو سمجھا لوں گی۔

اس نے طیبہ کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ پہلے میں اسے تسلی دیتا تھا، جب اس نے مجھے پریشان دیکھا تو اپنا غم بھول گئی۔ دل بری طرح زخمی ہو گیا۔

بیگم سے کہا، میں تم لوگوں کی ذمہ داری پوری نہیں کر سکا اور نہ تمہیں کوئی خوشی دی۔

طیبہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ شوہر سے کہا، ناشکری

مت کرو۔ اللہ نے ہمیں کسی کا محتاج نہیں بنایا۔ اللہ کا شکر ہے گزر بسر ہو جاتی ہے، بچے اسکول جاتے ہیں، بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ عید کے کپڑے ہی تو ہیں پھر آ جائیں گے۔

حیدر نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔

حیدر بھائی! کوئی ملنے آیا ہے۔ فیکٹری کے ایک ملازم نے اطلاع دی۔ مجھ سے ملنے کے لئے کون آ سکتا ہے۔ اس سے پہلے تو کوئی نہیں آیا۔ ملاقاتیوں کے لئے مخصوص کمرے کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود نوجوان نے سلام کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ میرا نام احمد ہے اور میں کچھ عرصہ قبل یہاں کام کرنے والے چوکیدار افضل کا بیٹا ہوں۔

حیدر کو افضل چوکیدار یاد آ گیا، دو سال قبل فالج کی وجہ سے اس کی نوکری ختم ہو گئی تھی۔ احمد سے والد کا حال احوال دریافت کیا۔ احمد نے آنے کا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا چند سال پہلے میں زیر تعلیم تھا، مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ یونی ورسٹی کی فیس کے سلسلہ میں جب ابا نے آپ سے بات کی تو آپ نے انہیں اپنے بونس کی رقم دے دی تھی۔ پیسوں کا بندوبست نہ ہوتا تو مجھے تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑتی۔ ابا نے ہدایت کی تھی کہ جب میں نوکری پر لگ جاؤں تو قرض ضرور ادا کروں۔ اللہ کے کرم سے اچھی تنخواہ پر نوکری مل گئی ہے۔ امانت لوٹانے آیا ہوں۔

حیدر گنگ تھا۔ احمد نے جیب سے لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور ساتھ میں ایک بڑا پیکٹ بھی دیا۔

یہ کیا ہے ــــ؟ حیرت سے پوچھا۔

بھابھی اور بچوں کے لئے ابا کی طرف سے عید کے جوڑے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے۔ السلام علیکم۔

حیدر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ نے بونس کی رقم کے ساتھ عید کے جوڑوں کا بھی اہتمام کر دیا تھا۔

بچو! عید مبارک

عید مبارک پیارے بچو عید مبارک
اے اس دیس کے سارے بچو عید مبارک

ملی ہیں تم کو عید کی خوشیاں
اک دوجے کی دید کی خوشیاں

گلے ملتے ہو تم پیاروں سے
اپنے دوستوں اور یاروں سے

میٹھی عید کا دن جب آئے
خوب سوّیاں ہمیں کھلائے

ابو، امی، بھائی، بہنیں
اچھے اچھے کپڑے پہنیں

عید مبارک پیارے بچو عید مبارک
اے اس دیس کے سارے بچو عید مبارک

ادارہ

اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا اور کائنات بنائی۔ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور و فکر کرتے ہیں وہ اولی الالباب (عقل و دانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کریں، سوچیں اور جو جواب ذہن میں آئے، ہمیں بھیج دیں۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلّہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

ذہین بچو! اسلام علیکم،

آپ کو رنگوں کی مشق دی گئی تھی جن کو ملانے سے مٹی کا رنگ بنا۔ پیارے بچو آؤ— کیوں نہ مٹی میں کھیل کر تجربہ کریں اور ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب تلاش کریں۔ گھر کے بڑے اور چھوٹے کھیل میں شامل ہو سکتے ہیں۔

تجربہ: چھوٹا سا پہاڑ بنائیں جس کی اونچائی تقریباً ڈیڑھ فٹ ہو۔ پہاڑ کی چوٹی کے درمیان میں لمبا تنا ڈال کر آہستہ سے اس طرح گھمائیں کہ پہاڑ میں ٹیوب نما جگہ بن جائے۔ تنے کو نکال کر سوراخ میں آہستہ آہستہ پانی ڈالیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پانی غائب ہو جائے گا۔ پانی کہاں غائب ہوا؟

اب پہاڑ کو گرائیں تو اندر سے گیلی مٹی نکلے گی۔ مٹی گیلی کیسے ہوئی—؟

پانی حلق میں سے گزر کر پیٹ میں جاتا ہے۔ جسم میں باریک مسام (سوراخ) کے ذریعہ پسینہ باہر نکلتا ہے، ہوا اندر داخل ہوتی ہے۔ اسی طرح مالش سے تیل جسم میں جذب ہوتا ہے۔ ہاتھوں کو غور سے دیکھئے۔ انتہائی باریک مسامات نظر آتے ہیں۔ یہ مسامات پورے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو خلا کہتے ہیں۔ کائنات کی ہر مخلوق میں خلا ہے۔ مٹی میں بھی خلا ہے جس کی وجہ سے مٹی نے سارا پانی پی لیا۔ آپ کو غور کر کے ان چیزوں کے نام بتانے ہیں جن میں خلا موجود ہے۔ یہ بھی سوچیں کہ مخلوق میں خلا ختم ہو جائے تو کیا ہوگا—؟

اپریل 2019ء میں اولی الالباب بچوں کو غیب ظاہر غیب سمجھایا گیا۔ بچوں کے جوابات یہ ہیں:

سلیمان ظفر، جماعت ہفتم (سرگودھا): پانی کا چکر ساری دنیا دیکھتی ہے۔ بادل برستے ہیں تو بادل غائب، بارش کا پانی پہاڑوں سے دریا، دریاؤں سے سمندر اور سمندر سے پھر آبی بخارات بن کر بادلوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ سائنس کی کتاب میں لکھا ہے کہ آج صبح ہم نے جس پانی سے چائے بنائی، کیا پتا وہ اربوں کھربوں سال پہلے کسی ڈائنوسار نے پیا ہو۔ کیا پانی غیب ہو گیا جب کہ دریا، سمندر زمین پر موجود ہیں؟

نورالعین، جماعت چہارم (اٹک): غور کرنے سے مثالیں ذہن میں آئیں۔

(۱) بلب میں روشنی غائب ہوتی ہے۔ سوئچ آن کرتے ہیں تو روشنی ظاہر ہوتی ہے۔

(۲) درخت بڑا نظر آتا ہے، جب کاٹتے ہیں تو غائب ہو جاتا ہے اور اس سے بہت ساری چیزیں بن جاتی ہیں۔

عرفانہ ناز، جماعت ششم (کراچی): بچہ دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو جہاں سے آیا ہے، وہاں غائب ہو جاتا ہے۔

نیرہ یوسف (کراچی): غیب ظاہر غیب پر غور سے بہت ساری باتیں سمجھ میں آئیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: ٹھنڈ ہوتی ہے تو گرمی غائب ہوتی ہے۔ خوش بو ظاہر ہونے سے بدبو غائب ہوتی ہے اور بدبو ظاہر ہونے سے خوش بو غائب ہوتی ہے۔ انڈے میں سے چوزہ ظاہر ہوا، انڈا غائب ہو گیا۔ چوزہ غائب ہو کر مرغی ظاہر ہوئی اور مرغی سے انڈا بنا۔

عمر بلال، جماعت ششم (کوئٹہ): ہم سوتے ہیں تو دوسری دنیا ظاہر ہوتی ہے لیکن جسم یہیں رہتا ہے۔ میرے دوست نے خواب میں مجھے اپنے ساتھ کھیلتے دیکھا لیکن میں نے خواب میں خود کو اڑتے ہوئے دیکھا۔ جسم سو رہا تھا پھر میں ایک وقت میں دو جگہ کیسے ظاہر ہوا—؟

حبہ (عمر ۳ سال): پاپا کے پاس پیسے آتے ہیں پھر غائب (خرچ) ہو جاتے ہیں۔

(عریشہ فراز): بارش ہوتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔

انعم (کراچی): پانی نل میں آتا ہے، غائب ہو جاتا ہے۔ پھول ہر موسم میں کھل کر غائب ہو جاتے ہیں۔

(عروسہ): امتحان ہوتے ہیں— غائب ہو جاتے ہیں۔

(الوینہ): قربانی کی گائے آتی ہے، غائب ہو کر اگلے سال پھر آجاتی ہے۔

(نور خالق، چشمہ میانوالی): بیج کا درخت بننا اور پھر پھل میں سے بیج کا نکلنا غیب ظاہر غیب کی مثال ہے۔

دیگر بچوں کے نام: سعدیہ، ایان، عاشر، سارہ زمان، ایمن انور، آصف منیر، مریم شریف، طلحہ زبیر

بھائی کے لئے بھائی کا ایثار

بارہ مہینے ملنے سے ایک سال بنتا ہے۔
دس سال ملتے ہیں تو ایک دہائی بنتی ہے۔
دس دہائی ایک صدی کے برابر ہے۔
ایک صدی میں سو سال ہوتے ہیں۔
یاد رکھنے کے لئے ایک بار پھر پڑھئے۔
بارہ مہینے ــــ برابر ایک سال
دس سال ــــ برابر ایک دہائی
دس دہائی ــــ برابر ایک صدی (100 سال)
ہم جس صدی میں رہتے ہیں یہ اکیسویں صدی ہے جس کے اب تک 19 سال گزر چکے ہیں اس لئے اسے سال 2019ء کہتے ہیں۔

بچو! جو کہانی آپ پڑھ رہے ہیں، یہ چھ سو سال پرانی ہے۔

پندرہویں صدی کی بات ہے۔ کسی گاؤں کے ایک چھوٹے سے گھر میں اٹھارہ لوگوں پر مشتمل خاندان رہتا تھا۔ سب سادہ مزاج اور شکر ادا کرنے والے لوگ تھے۔ گھر کے سربراہ کا پیشہ سنار تھا۔ اس کا کام چھوٹے پیمانہ پر تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے میں اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا تاکہ عزت سے گزر بسر ہو۔

گھر میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے سب کی ضرورت پوری کرنا آسان نہیں تھا لیکن سنار باہمت انسان تھا۔ باپ کے اندر محنت کا جذبہ بچوں میں منتقل ہوا۔

سنار کے بچوں میں سے دو بیٹوں کی خواہش تھی کہ وہ شہر جائیں اور وہاں فنون لطیفہ (فائن آرٹس) کے اسکول میں داخلہ لیں۔ ان میں سے ایک کا نام البرٹ اور دوسرے کا نام البریشت تھا۔ دونوں کو مصوری اور مجسمہ سازی کا بے حد شوق تھا۔ ہاتھ میں صفائی بہت تھی۔ جو شے بناتے، نقل پر اصل کا گمان ہوتا۔

دونوں بھائی جانتے تھے کہ ابا کی کمائی اتنی نہیں ہے کہ وہ آرٹ اسکول میں داخلہ لے سکیں۔ ہر وقت اس جستجو میں رہتے کہ کس طرح شوق کی تسکین ہو۔ کبھی ایک تدبیر سوچتے اور کبھی دوسری۔ آرٹ اسکول میں داخلہ کی خواہش جنون بن گئی۔

پیارے بچو! جب بندہ کسی مقصد کا عزم کرتا ہے تو وسائل متحرک ہونے لگتے ہیں۔

داخلہ کے لئے پیسوں کے انتظام کی منصوبہ بندی میں بالآخر انہیں راستہ ملا۔ جیسے تاریکی میں روشنی مل گئی ہو۔ ایک روز ان کے ذہن میں ترکیب آئی۔

دونوں بھائیوں نے معاہدہ کیا کہ ایک بھائی قریبی کوئلے کی کان میں محنت مزدوری کر کے پیسے جمع کرے گا اور دوسرا اسکول جائے گا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد دوسرا بھائی اسکول جائے گا اور اس کی فیس پہلا بھائی ادا کرے گا، چاہے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسے کوئلے کی کان میں کام کیوں نہ کرنا پڑے۔ کون سا بھائی اسکول جائے گا یہ طے ہونا باقی تھا۔

سکّہ اچھال کر فیصلہ کیا گیا— جو جیتے گا وہ اسکول جائے گا، ہارنے والا کوئلے کی کان میں مزدوری کرے گا۔ البرٹ نے سکّہ اچھالا تو فیصلہ البریشت کے حق میں آیا۔ اس طرح وہ مصوری سیکھنے کے لئے نورم برگ چلا گیا جب کہ البرٹ وعدہ کے مطابق کوئلے کی کان میں مزدوری کرنے لگا۔

نورم برگ آج جرمنی کا شہر ہے۔

بچو! کوئلے کی کان میں کام کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ یہاں کام کرنے والوں کو کان کن کہتے ہیں۔ کوئلا تلاش کرنے کے لئے پہاڑ میں گہری سرنگیں کھودی جاتی ہیں — اندھیرے کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ہر مزدور کی ٹوپی پر لائٹ لگی ہوتی ہے، رسیوں کی مدد سے وہ کان میں جاتا ہے، کھدائی کرتا ہے، معدنیات تلاش کرتا ہے۔ کئی مزدور گھٹن کے باعث مر جاتے ہیں اور کچھ پہاڑی تو وہ گرنے سے کان میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔

کان کنی جان خطرہ میں ڈالنے والا کام ہے لیکن مجبوری میں بندہ ہر کام کرتا ہے۔ البرٹ نے وعدہ نبھایا اور کوئلے کی کان میں چار سال محنت سے کام کیا۔ وہ وعدہ کے مطابق بھائی کو باقاعدگی سے پیسے بھیجتا تھا تاکہ بھائی کی تعلیم جاری رہے۔

کالج میں البریشت کی ذہانت نے سب کو متاثر کیا۔ وہ لکڑی کو اس خوب صورتی سے تراشتا کہ ہر شاہکار جیتا جاگتا محسوس ہوتا۔ اس نے مختصر عرصہ میں آرٹ اسکول میں شہرت حاصل کر لی اور تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی کمانا شروع کر دیا۔

تعلیم کے بعد آرٹ اسکول کو خیر باد کہا اور گاؤں

واپس آیا۔ گھر والوں نے خوشی میں دعوت کا اہتمام کیا۔ سب بہت خوش تھے۔ کھانے کے اختتام پر البریشت نشست سے اٹھا اور کہا،

''میں اپنے بھائی البرٹ کا شکر گزار رہوں۔ البرٹ نہ ہوتا تو میں آج جس مقام پر ہوں، یہاں ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس کی قربانی کے نتیجہ میں، میں اپنا خواب پورا کرنے کے قابل ہوا۔ وعدہ کے مطابق اب البرٹ کی باری ہے وہ اپنا خواب پورا کرنے نورم برگ جائے۔''

ٹیبل پر موجود تمام لوگوں نے مسکراتے ہوئے البرٹ کی طرف دیکھا — لیکن البرٹ سر جھکائے رو رہا تھا۔ سب لوگ اسے روتا دیکھ کر افسردہ ہو گئے۔ اس کا چہرہ تکالیف کی تصویر تھا۔

البرٹ کی آواز نے خاموشی کو توڑا،

''نہیں — میں نہیں جاؤں گا۔ میں اب نہیں جا سکتا میرے بھائی، بہت دیر ہو گئی ہے۔ صحت اب اجازت نہیں دیتی۔''

اس کے بعد اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا،

''دیکھو کوئلے کی کان نے میرے ہاتھوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔ ایسی کوئی انگلی نہیں جس کی ہڈی

ایک بار نہ ٹوٹی ہو۔ میرا جسم اتنا کم زور ہو گیا ہے کہ گلاس اٹھاتے ہوئے ہاتھ لرزتا ہے۔ ہاتھ اس قابل نہیں رہے کہ برش اٹھا کر کینوس پر رنگ بکھیر سکوں لیکن مجھے بہت خوشی ہے کہ تمہارا خواب پورا ہو گیا۔''

بات پوری کر کے وہ خاموش ہو گیا۔

البریشت نے جب البرٹ کی انگلیاں دیکھیں تو اس کی آنکھیں سمندر بن گئیں۔

اس واقعہ کو چھ صدیاں گزر گئی ہیں۔ البریشت کے فن پارے دنیا کے بڑے میوزیم میں آویزاں ہیں۔ اس کا ایک فن پارہ بہت مشہور ہوا۔ البریشت

نے یہ فن پارہ اپنے بھائی کی قربانی کو خراج عقیدت پیش کرنے اور دنیا کو بتانے کے لئے بنایا تھا کہ کس طرح بھائی البرٹ نے اپنی زندگی کے قیمتی سال اس کے لئے وقف کر دیئے۔

بچو! کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ فن پارہ کیا تھا؟

البریشت نے قلم و سیاہی کی مدد سے ایک تصویر بنائی جس میں البرٹ کے ہاتھ کی بہت تفصیل سے تصویر کشی کی۔ ٹیڑھی انگلیاں بنائیں اور دونوں ہاتھ کی ہتھیلیاں آس پاس اس طرح رکھیں جیسے دعا کرتے ہوئے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ ٹیڑھی انگلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھا۔ اس نے فن پارہ کو ''ہینڈز'' (hands) کا نام دیا۔

لوگوں نے البریشت کے فن پارے کو خوب سراہا اور ہر جگہ پذیرائی ملی۔ وقت کے ساتھ اس فن پارہ کا نام تبدیل ہو کر ''The Praying Hands'' ہو گیا یعنی دعا کرنے والے ہاتھ۔

فن پارہ کو دیکھنے والا ہر فرد البرٹ کی تعریف کرتا ہے کہ اس نے اپنے خواب کو نظر انداز کر کے بھائی کے خواب کو پورا کرنے کے لئے زندگی کے قیمتی سال اور صحت کا نذرانہ پیش کیا۔

بچو! اپنی خواہش کو ترک کر کے کسی کی خواہش کو پورا کرنا آسان نہیں ہے لیکن ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں جو ایثار کرتے ہیں۔ دوسروں کے لئے ایثار کرنے والوں کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہتا ہے۔ البرٹ کے دعا کے لئے بلند ہاتھوں میں اس کی زندگی کی کہانی محفوظ ہے۔

یہ فن پارہ آج بھی موجود ہے اور آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کے میوزیم البرٹینا میں محفوظ ہے۔

اڑنے والی مچھلی

کیا آپ جانتے ہیں کہ مچھلیاں بھی اڑتی ہیں؟ مچھلیوں کی ایک قسم پرندوں کی طرح اڑتی ہے۔ اسے فلائنگ یا گلائیڈر فش کہتے ہیں۔ یہ سطح پر آ کر تقریباً پچاس میٹر کے فاصلہ تک پرواز کر سکتی ہے۔ رنگ اوپر سے گہرا نیلا اور نیچے سے چاندی جیسا ہے۔ قد تقریباً ۱۸ انچ اور عمر کم و بیش پانچ سال ہے۔

کہانی کا نام ــــ؟

چاند کی چودھویں تاریخ تھی، دودھیا روشنی سے زمین روشن تھی۔ ایک مسافر رات میں سفر کر رہا تھا، چاند کی تعریف کرتے ہوئے بولا، اے چاند! تم کتنے اچھے اور مہربان ہو۔ تمہاری ٹھنڈی روشنی سے رات کا اندھیرا اجالے میں بدل گیا ہے۔ تمہارا وجود ہمارے لئے نعمت ہے۔ اب دیکھو، تمہاری چاندنی میں میرا سفر کتنا آسان اور خوش نما ہو گیا ہے۔

مسافر یہ کہتا ہوا اپنے راستہ پر روانہ ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت اس شہر کے ایک گھر میں چور، چوری کی غرض سے داخل ہوا۔ چاند کی روشنی میں اسے خوف نے آگھیرا کہ پکڑا نہ جاؤں۔ وہ گھر کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا اور چاند کو کوسنے لگا ــــ اے چاند، تیرا وجود میرے لئے پریشانی بن گیا ہے۔ تو میری آزادی اور رزق میں رکاوٹ بنتا ہے۔ کاش سیاہ بادل تجھے ڈھانپ لیں کہ مجھے تیری شکل نظر نہ آئے۔ میرا بس چلے تو کبھی تیری صورت نہ دیکھوں! اگر تو پیدا نہ ہوتا تو رات کے اندھیرے میں میرا کام آسان ہو جاتا۔

چاند نے مسافر اور چور دونوں کی باتیں سنیں اور ہنس دیا۔ اس نے سرگوشی کی، سرگوشی لہروں کے دوش پر مسافر اور چور تک پہنچی۔

''تم دونوں نے جو کہا ہے، یہ تمہاری رائے ہے، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں محض چاند ہوں۔ سورج سے روشنی حاصل کرتا ہوں۔ تعریف کرنی ہے تو سورج کی کرو اور اگر شکایت کرنی ہے تو سورج سے کرو۔''

چلچلاتی دھوپ میں قلفی والا پسینہ میں شرابور ریڑھی کو دھکا دیتے ہوئے چل رہا تھا۔ ساتھ میں رسی کھینچتا جاتا۔ رسی کا ایک سرا گھنٹی سے بندھا ہوا تھا۔ ٹن ٹن کی آواز نے خاموشی میں شور پیدا کیا لیکن سخت دھوپ کی وجہ سے بچے گھروں سے باہر نہیں نکلے۔ وہ پریشان ہو گیا اور بولا، گرمی کی وجہ سے بچے گھروں سے باہر نہیں نکل رہے۔ برتن میں برف پگھل رہی ہے، قلفیاں بھی پگھل جائیں گی۔ آج گرمی سے مجھے بہت نقصان ہو گا۔

قلفی والا دل ہی دل میں سورج کو کوسنے لگا۔

اس شہر سے تھوڑے فاصلہ پر گاؤں تھا جہاں کھیت میں کسان پسینہ میں شرابور فصل کاٹ رہا تھا۔ پسینہ کے قطرے زمین پر گر رہے تھے لیکن کسان کے چہرہ پر اطمینان تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا کہ اللہ کا شکر ہے اس سال خوب گرمی پڑی ہے ورنہ فصل خراب ہوجاتی۔ فصل خراب ہونے سے کیا بچتا اور ہم کیا کھاتے۔ اور تو اور ملک میں اناج کی کمی ہوجاتی۔ دوسرے ملک سے گندم مہنگے داموں درآمد کرنا پڑتی جس سے مہنگائی بڑھ جاتی۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے سورج بنایا۔

دوستو! جب کوئی شے تجارت کی غرض سے دوسرے ملک سے منگوائی جاتی ہے تو اسے درآمد کہتے ہیں۔ اور جب اپنے ملک سے غیر ملک میں بھیجی جاتی ہے تو اسے برآمد کہتے ہیں۔

سورج نے کسان اور قلفی والے کی باتیں سنیں تو مسکرادیا۔ سورج نے سرگوشی کی،

''میں تم دونوں کی بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں تو سیاہ توے کی طرح ہوں — مجھے روشنی کہیں اور سے ملتی ہے۔ تعریف کرنی ہے یا شکایت — روشنی بنانے والے سے کرو۔''

ایک بار اس شہر میں زبردست قحط پڑا۔ بہت دن گزر گئے مگر بارش نہیں ہوئی۔ کھیت کھلیان سوکھنے لگے۔ ندی نالے خشک ہوگئے۔ چارہ نہ ملنے کی وجہ سے مویشی مر رہے تھے۔ چاروں طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔

تمام کسان پریشان ہوگئے۔ پریشانی میں ایک درویش کے پاس گئے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ درویش کے پاس ایک بادل ہے جسے فضا میں چھوڑنے سے بارش برستی ہے۔

درویش نے کسانوں سے پوچھا کیا بات ہے، خیریت ہے؟ کسانوں نے کہا، جناب ملک میں قحط ہے۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ آپ کے پاس بادل ہے، مہربانی کرکے اسے فضا میں بھیجئے اور پانی برسا کر سب کا بھلا کیجئے۔

درویش نے فرمایا، اللہ کا حکم ہوا تو بارش ضرور ہوگی۔ وہ کھیت کی طرف گئے اور وہاں جاکر مٹھی کھولی۔ اندر سے بھاپ نکلی اور سخت گرمی کی وجہ سے بخارات اوپر کی طرف گئے اور بلندی پر بادل ظاہر ہوگیا۔ اس وقت کہیں سے شہنائی بجنے کی آواز آئی اور کچھ ہی دیر میں بارات پہنچی۔ ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی۔ کسان کے بچے خوشی سے شور مچاتے

ہوئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔

دوسری طرف پانی کی بوندیں بارات پر گریں تو باراتی پریشان ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ بارش برسنا یہاں پر مقیم ایک درویش کی دعا سے ہے۔

وہ درویش کے پاس پہنچے اور عرض کیا، جناب ہم باراتی ہیں، دلہا ہمارے ساتھ ہے، دلہن لینے آئے ہیں۔ تھوڑا خیال کیجئے اور شادی کے دن بارش کو برسنے سے روکیں۔ البتہ رات میں برسادیں۔ ورنہ کیچڑ میں بارات لے کر پہنچیں گے۔

درویش نے سر ہلایا اور کہا، اچھا۔ ہتھیلی کھولی، فضا میں موجود بادل ان کے ہاتھ میں آگیا اور انہوں نے مٹھی بند کردی۔ رات ہوئی۔ بزرگ نے آسمان کی طرف بادل کو بھیجا اور دعا کی۔ بوندا باندی شروع ہوگئی۔ اتنے میں تین چار آدمی جو اپنا گھر تعمیر کررہے تھے پریشانی کے عالم میں آئے اور بولے، جناب! کیا یہ بارش کا وقت ہے! بارش رکوادیں ورنہ سارا سیمنٹ بہہ جائے گا۔ بارش صبح ہوجائے تو تب تک ہم سامان کو چھت کے نیچے محفوظ کرلیں گے۔

درویش نے ان کی بھی سنی اور کہا اچھا۔

وہ لوگ خوشی خوشی گھر چلے گئے۔

صبح کسان بارش کی درخواست لئے دوبارہ آئے۔

درویش نے بارش کی دعا کی، بارش برسنے لگی۔

ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہا، جناب! بارش روک دیجئے۔ میں نے ابھی ابھی گھر پر رنگ و روغن کیا ہے، سارا اتر جائے گا۔

درویش نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی اہلیہ سے کہا، کل پھر کسی کی شادی ہوگی، کسی کا بچہ ہوگا، کسی کی دعوت ہوگی، کوئی فاقہ کررہا ہے، کسی نے گھر میں اناج ذخیرہ کیا ہوا ہے، کسی کے گھر میں پانی کی بوند نہیں اور کوئی پانی ضائع کرتا ہے — کوئی بارش کی درخواست کرتا ہے اور کوئی بارش رکوانے کی۔ یہاں سب کو اپنی پڑی ہے۔ شکر ہے کہ نظام کائنات کا خالق اللہ ہے اور وہ اپنے نظام کو عمدگی سے چلاتا ہے۔ اگر یہ نظام لوگوں کی مرضی سے چلے تو دنیا میں کیا ہو! فساد اور تباہی پھیل جائے گی۔ کوئی کسی سے خوش نہیں، سب اپنی خوشی میں خوش ہیں۔ جن لوگوں کو اپنی پڑی ہو، وہ دوسروں کی تکلیف نہیں سمجھتے، ایسی بستیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔ سامان باندھو، ہم یہ شہر چھوڑ کر جارہے ہیں۔

اللہ میاں کے باغ کے پھول پیارے بچو!

کہانی پڑھ کر آپ کیا سمجھے —؟

خواب تعبیر اور مشورہ

حضور قلندر بابا اولیاؒ

محمد برہان، کوٹ ادّو۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ کی ایک تصویر مختلف سائز میں بڑی تعداد میں دیکھیں۔ اس تصویر میں حضور قلندر بابا اولیاؒ نے گہرے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہیں۔ غلافی پھولوں کے ہار ہیں یا اسی رنگ کی واسکٹ ہے یہ میں سمجھ نہیں سکا۔ تصویروں کو بائیں طرف سے دیکھتے ہوئے دائیں طرف نظر گئی تو گھر کے پرانے نقشہ کے مطابق مغربی کمرے کے سامنے چھوٹی سی کیاری مشرقی رخ پر تھی۔ اس میں حضور قلندر باباؒ ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں اور تصویر کی طرح کا لباس اور چہرہ حسین و شاداب ہے۔

وہ مسکراتے ہیں تو میں قریب آتا ہوں اور ادب سے جھک کر سلام کرتا ہوں۔ انہوں نے میرے کندھوں کے درمیان گردن کے جوڑ کے پاس انگوٹھے سے کچھ دیر تک دبایا پھر فرمایا، ہم نے اتنی دیر کسی کو نہیں دبایا۔ میں بہت ادب سے عرض کرتا ہوں کیا کبھی آپ کا دیدار بحالت بیداری ہوسکتا ہے؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

میں چارپائی پر سو رہا تھا، آنکھ کھلی تو امی اور بھائی کمرے کے اندر سامان لا رہے تھے کیوں کہ باہر بارش ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھا اور خوشی خوشی امی کو بتایا کہ میں نے حضور قلندر بابا اولیاؒ کا خواب میں دیدار کیا ہے۔ امی ادب سے سر پر دوپٹا اوڑھ کر بیٹھ گئیں اور خواب سن کر فرمایا، ارادہ کر رہی ہوں کہ ان کے مزار پر حاضر ہوں۔ ایصال ثواب کے لئے کچھ پکاؤں گی جس کے لئے ایک کلو گھی منگوایا ہے۔ میں وہیں سو گیا۔

تعبیر: اسباق کی پابندی کریں تاکہ حضور قلندر بابا اولیاؒ کی تعلیمات کا ادراک ہو۔

پولیس

بلال، کراچی۔ ایک بزرگ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر طواف کر رہا ہوں۔ وسوسہ آیا کہ وہاں کی پولیس (شُرطہ) نہ دیکھ لے۔ بزرگ نے فرمایا کہ فکر نہ کرو، ہم انہیں نظر نہیں آ رہے۔ کچھ دیر میں ایک اور صاحب ہماری گاڑی میں بیٹھ گئے۔

تعبیر: جب ذہن میں ایسے خیالات کا ہجوم ہو جاتا ہے جس میں بے یقینی داخل ہو جائے جب کہ بے یقین ہونے کی کوئی وجہ بھی نہ ہو تو اس قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھیں۔ دن میں چلتے پھرتے

''یا حیی یا قیوم'' کا ورد کریں اور رات کو سونے سے پہلے اچھا لباس پہن کر خوش بو لگائیں اور بہت ادب و احترام کے ساتھ سو مرتبہ درود شریف پڑھیں اور پڑھتے پڑھتے سو جائیں۔ ایک نیند لینے کے بعد بات کر سکتے ہیں۔

کالے نہیں پیلے بچھو

اختر، کورنگی۔ گھر کے قریب بیٹھا زمین کھود کر بچھو نکال رہا ہوں۔ کوئی شخص آ کر کہتا ہے پیلے نہیں کالے بچھو نکالو۔ میں کالے بچھو نکال کر زمین پر ڈھیر کر رہا ہوں کہ بھائی لائٹ لے کر آ گیا۔ میں غصہ ہوتا ہوں کہ لائٹ کیوں لائے، بچھو ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ وہ لائٹ بند کر دیتا ہے اور میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو گھبرا کر فوراً بستر جھاڑا۔ اس خواب سے بہت پریشانی ہے۔

تعبیر: ذہن کی حفاظت کیجئے۔ خدانخواستہ پریشانی لاحق ہو سکتی ہے۔ سوچ میں پاکیزگی نہیں ہے۔ غصہ نہ کریں اور انتقامی جذبہ کو فوراً رد کر دیں۔ اللہ حاضر و ناظر ہے۔

سورہ میں پانچ صفات

لبنیٰ نذیر، کوٹ ادّو۔ کسی بلند جگہ حضور پاکؐ سے چند قدم پیچھے کھڑی ہوں۔ آپؐ نے خاکی رنگ کی چادر اوڑھی ہے اور چہرہ مبارک جنوب کی طرف ہے۔ حضور پاکؐ کے سامنے جنوب مغرب کی طرف میرے شوہر کھڑے ہیں جو مجھ سے کہتے ہیں کہ نبی پاکؐ سے جو درخواست کرنی ہے کرو، میں کہتی ہوں، آپ عرض کر دیجئے۔

تعبیر: خواب میں ایسے تمثیلات ہیں کہ آپ کا دل اللہ کی مخلوق کی خدمت کر کے خوش ہوتا ہے۔ بلا شبہ خدمت خلق کا جذبہ اللہ کے محبوبؐ اور اللہ کے لئے پسندیدہ عمل ہے۔ صاحب فہم لوگ جب غور کرتے ہیں تو یہ عمل مشاہدہ بن جاتا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔ سورہ اخلاص میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کہو اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور اس کا کوئی خاندان نہیں۔''

اس سورہ میں پانچ صفات بیان ہوئی ہیں۔

اللہ واحد ہے، بے نیاز ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی کنبہ برداری خاندان نہیں۔

تفکر کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی صفات کا ادراک ہوتا ہے۔ مخلوق ایک نہیں ہوتی، ہر مخلوق کسی کی اولاد ہوتی ہے یا ماں باپ بنتی ہے۔ اللہ کی کوئی اولاد نہیں نہ وہ کسی کی اولاد ہے، بے نیاز ہے، کسی بھی طرح کسی شے کا محتاج نہیں اور اللہ کا کوئی خاندان نہیں۔ وہ ہر اعتبار سے واحد ہے۔ ہر زاویہ سے صاحبِ قدرت ہے۔ اللہ نے کُن فرمایا لا شمار دنیائیں اور ان میں مخلوقات ظاہر ہو گئیں۔ مخلوق کے لئے وسائل پیدا کئے لیکن خود وسائل سے بے نیاز ہے۔ مخلوق کو زندگی عطا فرماتا ہے اور زندگی گزارنے کے لئے پیدائش سے پہلے وسائل موجود

ہیں۔اللہ رب العالمین ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اللہ واحد خالق کائنات ہے، مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور جو لوگ مخلوق کی خدمت کرتے ہیں انہیں پسند کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

''ہم نے قرآن کو سمجھنا آسان کر دیا، ہے کوئی سمجھنے والا؟'' (القمر:۱۷)

کسی نے سوئی چبھوئی

نام شائع نہ کریں۔شادی کی تقریب میں لوگوں سے بات چیت ہونے کے بعد ایک خاتون کی بیٹی کو دیکھا جو بہت روتی ہے۔اسے دیکھنے لگی تو تمام رشتہ دار میرے اردگرد جمع ہوجاتے ہیں۔بچی کی قمیص اوپر اٹھائی تو پیٹ اور سینہ کے درمیان ایک pin لگی ہے۔میں نے پن نکالی تو کسی نے پھر اسے پن چبھودی جس سے وہ رونے لگی۔مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی گئی۔میں بچی پر سورہ فلق اور سورہ ناس پڑھ کر پھونکتی ہوں اور اس کے لئے دعا کرتی ہوں۔پھر بچی کے ماتھے، پیٹ اور کمر پر بہت ساری پنیں چبھوئی گئیں اور وہ پنیں بڑی اور باریک ہونے لگیں۔بچی بہت تکلیف میں ہے۔میں روتی ہوں کہ یہ کیا ہورہا ہے۔پنیں نکالتی ہوں تو کچھ پانی نکلتا ہے۔پنیں چبھنا بند ہوجاتی ہیں۔

مجھے وہ پتلا نظر آیا جس پر سوئیاں چبھو کر جادو کیا گیا تھا۔پھر کسی خاتون کی آواز سنائی دی کہ بچی کو دودھ پلاؤ۔میں منع کردیتی ہوں کہ ہوسکتا ہے دودھ میں کچھ ملا ہو۔آواز آتی ہے تم نے دودھ نہ پلا کر غلطی کی۔میں بچی کو چمچ سے میٹھا دودھ پلاتی ہوں۔ایک چمچ پی کر وہ سوجاتی ہے کیوں کہ جو سوئیاں چبھو رہا ہے وہ بھی سوگیا۔بچی کو کمبل میں لپیٹ کر کہتی ہوں کہ صبح ایک بابا کے پاس جاؤں گی کہ اس کا کچھ کریں۔کمبل میں لپٹی بچی کو اٹھایا تو وہ روئی۔مجھے لگا پھر کسی نے سوئی چبھوئی مگر دیکھنے پر پتہ چلا ایسا کچھ نہیں ہے۔بچی سے کہتی ہوں کیا ہوا کیوں رورہی ہو۔ہم سب واپسی کے لئے روانہ ہوتے ہیں اور میں بچی کے منہ پر کپڑا ڈال دیتی ہوں کہ کوئی نظر نہ لگادے۔ایک قبرستان کے قریب سے گزرے تو پھر دونوں سورتیں پڑھ کر بچی پر پھونکتی ہوں۔اندھیرا ہونے لگا تو مجھے خوف محسوس ہوا۔دونوں سورتیں پڑھتے پڑھتے میری آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: خواب میں ذہنی انتشار کے خاکے زیادہ ہیں۔الجھے ہوئے خیالات اور پریشان خیالی میں اس قسم کے خواب نظر آسکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو قلبی سکون عطا فرمائے۔جو کچھ آپ پڑھ رہی ہیں وقت کی پابندی کے ساتھ پڑھیں، انشاءاللہ سکون ملے گا۔

مجھے کامل بنادیا

نام شائع نہ کریں، فیصل آباد۔ایک خانقاہ میں دیوار سے پشت لگائے بیٹھا ہوں۔وہاں موجود بزرگ کا کمرا سامنے ہے جہاں جوق در جوق جوتے اتار کر لوگ اندر جارہے ہیں۔خیال آتا ہے کہ میں اتنے عرصہ سے بیعت ہوں، کاش میں کامل ہوتا اور لوگوں کی خدمت کرتا۔اس خیال کے ساتھ ہی بزرگ نظر آئے، وہ میری

طرف توجہ فرما کر مجھے کامل بنا دیتے ہیں جس کے بعد لوگ میرے پاس بھی جوتے اتار اتار کر آنے لگتے ہیں۔

تعبیر: آپ کے خواب میں فکشن زیادہ ہے۔ یہ طلب کہ میں صاحبِ کرامت ہوں اور لوگ میرے پاس آئیں اور پھر لوگ جوتے اتار کر آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں یہ طرز فکر غلط ہے۔ ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ استغفار پڑھا کریں اور اللہ تعالیٰ کی صفات پر غور کریں۔ خواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن ایسے خیالات میں الجھا ہوا ہے جس میں خود نمائی یعنی شہرت ہے کہ لوگ آپ کے پاس آئیں۔ یہ سوچ اخلاص کے خلاف ہے۔ آپ سورہ اخلاص پانچ مرتبہ ترجمہ کے ساتھ پڑھئے اور نیوٹرل ذہن سے سوچئے۔

طریقہ یہ ہے کہ قل ھو اللہ احد — اللہ ایک ہے، ہر شے سے بے نیاز ہے، کسی کی اولاد نہیں، کسی کا باپ نہیں، اس کا کوئی خاندان نہیں، وہ ان تمام رشتوں سے مبرا ہے۔ آپ غور کیجئے جتنا زیادہ غور کریں گے انشاء اللہ اتنا ہی آپ کا ذہن کھلے گا اور خواب کی تعبیر اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی۔

اُس عالم سے واپسی

حارث غوری۔ مراقبہ ہال کے گیٹ پر پہنچا تو ایک صاحب باہر آئے جنہیں سہارا دیتا ہوں۔ ان کے کہنے پر انگلی سے زمین پر اعداد میں کچھ لکھتا ہوں۔ منظر بدلا اور ایک عمارت میں انہی صاحب کے ساتھ موجود ہوں۔ ہم آگے بڑھے تو دائیں طرف کچھ لوگ بیٹھے الہامی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ہر مذہب کے لوگوں کو الہامی کتابوں سے فیض مل رہا ہے۔ مزید آگے گئے تو میرے ہم راہی اپنے ہاتھوں کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہیں جس سے دھواں سا آجاتا ہے، محسوس ہوا کہ انہوں نے نظر اتاری ہے۔ وہ اپنے سر سے کوئی شے اتار کر دیتے ہیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، اس کا حجم تقریباً ایک انچ، کاسہ کی مانند اور اوپر سے بند ہے۔ اسے سر پر رکھتے ہی اس میں سے بہت پانی نکلتا ہے جسے نیچے گرنے سے بچانے کے لئے میں پینا شروع کرتا ہوں اور پیتے ہی وہ ختم ہوجاتا ہے۔ کچھ فاصلہ پر چند لوگ بیٹھے ہیں جن میں سے ایک قریب آکر غصہ سے دیکھتا ہے۔ خیال آیا یہ انسان نہیں ہے۔ دور بیٹھا ایک شخص قریب آنے کا اشارہ کرتا ہے تو فوراً ایک خاتون نظر آئیں جو بہت اچھے انداز میں کہتی ہیں کہ آپ کے یہاں سے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔ میں کہتا ہوں، ٹھیک ہے لیکن واپسی کیسے ہو کیوں کہ جن کے ساتھ آیا تھا وہ موجود نہیں ہیں۔ خاتون کہتی ہیں 41 مرتبہ فلاں آیت پڑھیں۔ میں مسکرا کر پوچھتا ہوں کہ کون سی آیت؟ وہ مسکراتے ہوئے کہتی ہیں کہ سیدنا حضور پاکؐ کے وسیلہ سے اس عالم سے واپسی ممکن ہے۔ یہ سنتے ہی احساس ہوا کہ ایک کونے میں کھڑا ہوں، آنکھیں بند کر کے درود خضری پڑھتے ہوئے خلوص دل سے حضور پاکؐ کے وسیلہ سے بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہوں۔ ان خاتون کی آواز آتی ہے کہ ہاں اب آپ

مثالی دنیا تک پہنچ گئے ہیں۔ درود شریف کا ورد جاری ہے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو قبرستان میں کسی بزرگ کی قبر کے پاس کھڑا ہوں۔ لوگ آ رہے ہیں اور فاتحہ پڑھ رہے ہیں ۔ میں ایک طرف ہوگیا۔ آنکھ کھلی تو فجر کا وقت تھا۔

تعبیر: ظاہر ہوتا ہے کہ آپ خدمت خلق کرتے ہیں اور یہ عمل اللہ تعالیٰ اور حضور پاکؐ کو پسند ہے۔ آپ نے جس دنیا میں خود کو دیکھا ہے وہ عالم اعراف ہے ۔ عالم اعراف وہ مقام ہے اس دنیا کے بعد ہم جہاں رہتے ہیں۔ مخلصانہ خدمت خلق اور درود شریف کی برکت سے آپ نے عالم اعراف (اس دنیا کے بعد کا عالم) کی سیر کی ہے جو سعادت کی بات ہے۔ الحمدللہ خواب مبارک ہے، آپ نے مرنے کے بعد کی دنیا کی سیر کی ہے ۔ اللہ تعالیٰ ان صاحبِ خدمت لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو مخلوق کی مخلصانہ خدمت انجام دیتے ہیں ۔

سوچ میں نمایاں تبدیلی

شاہ رخ ،کراچی ۔خواب میں دیکھا کہ کسی مزار کی زیارت کے لئے ریل گاڑی میں جا رہی ہوں ۔ وہاں پہنچے تو مزار بہت خوب صورت ہے۔ خادم ہمیں لنگر کھلانے لے جا رہا تھا کہ میری نظر ایک درخت پر پڑی جو کھلتے ہوئے سبز رنگ کا تھا اور اس پر آم جیسا کوئی ہرے رنگ کا پھل تھا۔ درخت کے ساتھ پھل بھی

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:.................................. والدہ صاحبہ کا نام: ....

پورا پتہ:..

ازدواجی حیثیت:........................ وزن (تقریباً): .... آنکھوں کا رنگ..................

نیند کیسی آتی ہے:............ بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):.............. تاریخ پیدائش:..................

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟.............................فون نمبر..................

خدانخواستہ دماغی ،نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات : ....

....

آنکھوں کو اچھے لگے۔ جب ہم خانقاہ سے باہر آئے تو مختلف لوگ لنگر تقسیم کر رہے تھے۔ زیادہ لوگ میٹھا دلیہ اور چائے پاپے تقسیم کر رہے تھے۔

تعبیر: غذا میں ہم مٹھاس اور نمک کھاتے ہیں۔ نمک مٹھاس کے مقابلہ میں کم کھایا جاتا ہے۔ غور کیا جائے ہر کھانے کی چیز میں مٹھاس غالب ہے۔ یعنی مٹھاس اور نمک دو مقداریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق نظام کائنات مقداروں پر قائم ہے۔ نمک ایسی مقدار ہے جو لاشعور کو تقویت دیتا ہے اور مٹھاس ایسی مقدار ہے جس سے شعوری صفات زیادہ ایکٹو ہوتی ہیں۔ اگر نمک اور مٹھاس کے استعمال میں توازن نہ رہے تو ''سوچ'' میں نمایاں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مقدار سے زیادہ نمک کا استعمال لاشعوری تحریکات کو تیز کرتا ہے جب کہ مٹھاس شعوری تحریکات کو فیڈ کرتی ہے۔ کھانوں میں نمک اور مٹھاس کی مقداریں اعتدال میں رکھیں اور اعتدال کے بارے میں ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

ن، ع، پشاور۔ **تعبیر۔** آپ جو کاروبار کر رہے ہیں اس میں بے احتیاطی ہو رہی ہے۔ بظاہر فائدہ نظر آ رہا ہے لیکن فائدہ نہیں۔ چلتے پھرتے وضو بے وضو یا حی یا قیوم پڑھیں۔

پیٹ میں درد

پیٹ میں درد کی وجوہات بے شمار ہیں۔ اصل علاج یہ ہے کہ درد کی وجہ تلاش کر کے اس کا علاج کیا جائے۔ عارضی اور فوری طور پر پیٹ کے درد سے نجات کے لئے یہ عمل کیا جائے۔ میدہ کی طرح باریک پسا ہوا نمک ایک چاول وزن کے برابر ایک ٹی اسپون پانی میں ڈال دیں اور ایک مرتبہ،

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ

پڑھ کر پانی پر دم کر کے پئیں۔ پانی پیتے وقت منہ شمال کی طرف ہونا چاہئے۔

بھینگا پن

جس وقت مریض بالکل سیدھا دیکھ رہا ہو اس کی آنکھیں بند کرا دیں اور اسکی اس آنکھ پر جو بھینگی ہے اندھیرے میں ہلکی سی پٹی باندھ دیں۔ پٹی باندھتے وقت یہ تصور کریں کہ میں اور مریض عرش کے نیچے ہیں۔ یہ پٹی اکیس روز تک بندھی رہے۔ پٹی میلی ہونے پر اندھیرے میں بدل دیں۔ پٹی باندھتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ نظر سیدھی رہے یعنی آنکھ کی پتلی درمیان میں ہو۔ اکیس روز کے اس عمل سے آنکھ کا بھینگا پن کلیتاً ختم ہو جاتا ہے۔

was? Why did I have to assume he will be with me till the end of journey and guide me out of the forest? Even if it were a small or imperfect lamp, it would have sufficed the purpose, but I never gave it a thought. I took it for granted that the man and the lamp will be with me till I reached my destination. I took my good fortune for granted and was never prepared for the surprise of life. And now it is too late. I am stranded in the middle of nowhere in such harsh darkness."

There was no one to hear his cries. He was too far from the village and also from the edge of the forest that led to the bus stop.

Moral of the story:

The lamp in this story refers to wisdom and the darkness represents ignorance.

Most of us are dependent on the light of wisdom in others than using the guiding light, which is instilled within ourselves. This light, inside each one of us, is the voice of our conscience. The guiding flame was lit inside us when God Almighty created us with His *Noor* (Divine light).

Most of the time the voice of conscience whispers to us the decisions we should take in life. It also informs us of what is right and wrong. One would notice the certainty in which this voice asserts the direction we must take or decision we must support. But, man who is constantly in the grip of fear and grief ends up doubting this voice and this act of ignorance leads to self-doubt and misery.

Man ignoring his conscience begins to depend on external opinions instead. We may be blessed with teachers, parents, family and friends who can guide us at all times, but if we do not raise our own awareness and knowledge, we will never be able to take independent decisions.

Nothing in life is permanent therefore when we loose people who have been guiding us we will be lost in darkness and unable to move forward in life. It is therefore very important that one values the company of those who take time to advise and guide us on the right path, and learn from their teachings.

Only those who depend on their internal voice of guidance succeed and those who do not, fail and slip into the darkness of ignorance. We have a duty not only towards ourselves but also towards those who depend upon us.

Just as we enjoy the guidance of the wise around us, we must be able to develop our inner conscious and build such a strong relationship with God that we become able to guide those who seek assistance from us in the times to come.

❁ ❁ ❁

The Traveller and Lamp

Only those who depend on their internal voice of guidance succeed and those who do not, fail and slip into the darkness of ignorance.

Once two travellers were travelling during the night through a rustic village. The village was situated in the remote parts of a dense jungle and there was no electricity. Moreover, it was a very dark night due to a new moon. All one could see was the beautiful twinkling stars that seemed to have blanketed the sky.

Both the travellers had visited the village to meet up with some friends and family and were ready to get back home. The travellers did not know each other and had only been acquaintances for the last few minutes. Visitors of the village had to cross the jungle and move to the highway for the nearest bus stop and it would take a good two hours of walk. Though the jungle was not home for deadly wild life one had to be careful of wild boars and bats.

One of the travellers did not have a lamp with him. Though many of his friends advised him to carry one and learn how to light it, he refused saying that he had noticed that the man he was accompanying had a lamp and that it would suffice for both of them. Moreover he lived in the city and felt buying a lamp would be waste of money, as he would have no use for it when he reached back home.

As the other traveller had a lamp with him and they were walking together both their paths were lit. He saw that the fellow traveller was shifting the lamp from one hand to another when he felt tired.

The man with no lamp was walking carefree. He was happy he had not carried his own lamp and smiled at his luck of not having to bear the weight of the lamp through the strenuous travel in the jungle. He considered himself fortunate to have found a person with a lamp walking in front of him. “I was right! There was no need for me to have my own lamp.” he reassured himself.

Then suddenly they arrived at a crossroad and the man who had the lamp went in the opposite direction bidding him goodbye. The traveller was not prepared for this. He had assumed that the second traveller was travelling to the same destination as he was. The path of the man without the lamp was suddenly conquered by darkness and he could not see the way forward. This caused him great suffering. He did not know what to do.

He began to weep and regret, “Why did I not buy my own lamp and learn how to light it? Why did I not heed the advise of my friends? Why did I not ask the man what his destination of travel

read light and when we understand anything, we understand light. Since when we read light, we will understand light. And what we understand is only information. It can be said that light and information is the same thing".

Explaining the relationship between matter and light, Mr. Azeemi says, "We know that in our solar system there are many stars. They bring light from somewhere and the minimum distance between them is five light years. Where their lights collide they make circles such as our earth and other planets. It means that at the point of collision of the lights of sun and billions and trillions of stars, a circle comes up which is known as a planet".

With the help of telescope, at the distance of billions of light years Quasar the source of light has been discovered. According to experts, there is a black hole at the center of Quasar. It mixes temperature and matter and moves at a high speed. High speed separates light and matter and matter becomes transparent. Thus basic material to create material Universe is made. Figure 3 shows procedure of creation showing smoke after separation of light and matter. It must be kept in mind that according to modern scientific theories carbon is a fundamental ingredient in the making of organic chemicals.

The Universe began 3 trillion years ago. Stars made of Hydrogen and Helium were big in size and had a small life span. The short span was due to low or non-existence of metallic quantities in them. These stars routinely broke up and merged together giving shape to suns like that of our times. Experts inform us of the presence of high quantities of metals in sun providing it necessary stability. This means that sun took a lot of time spanning over billions of years to evolve into its current shape. How the sun radiates this high amount of energy? The reply of this question is in Einstein's equation.

According to the scientists, the process of destruction of nucleus continues in Sun converting Hydrogen to Helium. Analysis of rays being radiated by Sun confirms that nuclear process can convert Hydrogen to Helium. Experiments confirm that hydrogen and helium found on Sun is similar to the ones found on Earth.

Is this Universe, in fact, expanding? What is the purpose of this expansion? What is the nature of this expansion? What are the dimensions of celestial bodies and what is their mutual relation?

Although the scientists are trying to find our credible replies to all these questions, thus far success eludes them. In the book *Qalandar Shaoor* it is written, "According to the holy Books, sky and earth rest on the base of light that connects everything in the Universe with God".

(To be continued)

further. It must be kept in view that temperature is caused by molecular vibrations. If vibrations are intense, temperature will be high. Irrespective of its being matter or not, its frequency will be accordingly higher. It is for this reason that high temperature and vibration causes equivalence in the expansion of this Universe. Question arises as to how this equivalence spread through such a huge space whereas at the speed of light this distance is covered in 1-2 billion years. This has yet to be explained.

Khwaja Shams al-Din Azeemi explains the presence of waves speedier than light wave.

"Although scientists consider light waves as the speediest, yet these waves are not speedy enough to shrink or cease time and space distances. However, the waves of *Ana* are present everywhere infinitely in space. Time and space distances remain in their control. In other words, for these waves time and space distances do not exist. The distances shortened by light waves are not even acknowledged by the waves of *Ana*."

It must be kept in mind that light reaching us is but a small fraction of light coming out of its source, only the fraction that is directed to our earth. How these rays spread in the Universe, is yet to be discovered. According to experts, while their spread, fundamental elements came into being which are called Quark-gluon Plasma. The two dimensions of this plasma were created called matter and anti-matter. Thousands of seconds after Big Bang, the two dimensions merged and transformed into nascent matter. After three minutes, vibrations slowed down and temperature fell and fundamental elements i.e. Hydrogen and Helium came into being. Quark-gluon plasma has not yet been created in laboratories and proven experimentally.

Scientists agree that proton and neutron are based on Quark. In order to create Quark, the scientists used accelerators such as Particle Accelerator to move atomic particles at a very high speed that causes destruction in the particles in the hope that this destruction would lead to the creation of Quark. But thus far, creation of Quark could not come about.

From 3 minutes to 4 million years, the Universe remained dense. After this, the temperature of the Universe fell to the extent that matter and energy/light came apart. An illustration in figure 3 shows Galaxy UDFY-38135539 of that time which according to figure 1 is 480 million light years away from the origin.

In this regard, the founder of Qalandar Shaoor, Qalandar Baba Aulia (RA) says, "Prophet Jesus (PBUH) said, God said light and there was light. In the words of Quran, *Kun Fa yakoon*, Be and it was. When our vision falls on a book, it is in fact light that falls on it since we can't see anything but light. When we read a book we

thus far collected needed to be linked. Through computer technologies, this data and statistics have been used to develop 3D model. This model has led us into new avenues of discovery and research which will be explained later.

This Universe is evolving with continued expansion of a sound. Nevertheless, the speed of sound waves is 343 meters per second whereas experts evaluate expansion in hundreds of thousands of km per second. This point is easy to understand. We can't hear sounds around us nor can we feel their movement such as the sound of our heart beat, movement of our other internal organs such as lungs, kidney and nervous system. These organs and systems associated with them perform in unison. We know that according to modern scientific theories material things are made of waves and waves are life. For instance, bulb is made of small particles and in itself retains the properties of an atom. When we switch it on, electricity enters it in waves and lightens it up. Touching live wires also makes one feel electricity waves. The vibration of electricity waves spreads across the body and generates vibration in the body and since human body does not have the tolerance of this vibration, it gets a shock. It is obvious that the spread of waves is the basis of a manifestation.

The theory of the spread of Universe was given by American physicist Alan Goth in 1980. According to figure 1, if we try to understand the Universe as it was 13 billion 700 million years ago, it will be like a point to be considered as the point of origin. It is the point where Universe began to spread. This phenomenon was introduced as the Big Bang by astronomer Fred Hoyle.

The frequency of light rays was studied with the help of Red Shift and the spread of this Universe was estimated. The rays coming to earth have greater frequency and those going away have less. This imparts ability to attract or repel to the rays or the rays are completely neutral. The distances determined using Red Shift technique and their comparison are called Hubble's law.

After Hubble, the question of Universe's origin was raised again. When the scientists explored the depth of Universe they surprisingly found out the origin of high frequency microwaves. The most important observation made by the experts was that spread and frequency of these waves was equal in every direction. This was contrary to other scientific observations. The prevalent theories indicated different temperature zones and frequencies quite unlike the discovery. This complicated issue was resolved by Alan Goth in 1980 when he said that right after Big Bang, the Universe spread out in a very short span of time. This spread was 10^78 times more than the Big Bang. The immediate spread led to dropping of temperature of the Universe quickly making it cold and halting its spread

Fig 1, Universe was born 13 billion 700 million years ago of which 93 billion LY perimeter has been observed. But thus far exact spread of Universe is not known. The main reason for lack of this information is continuing process of destruction and birth of systems in Universe. In this process, in order to maintain their stability new celestial bodies push other bodies away. This creates space between two celestial bodies where only forces of repulsion or attraction could be felt. These forces maintain balance and distance during the movement of celestial bodies. But as these distances grow, universal spread also increases. This spread has grown so much as the light from distant stars reaches us hundreds of thousands of years later than their emission. Or it doesn't reach us at all.

Qalandar Baba Aulia (RA) defined the relation between time and space as follows:

"Experts say that there is no other solar system except our own whose light reaches us in less than four years. They also inform us of stars whose light reaches us in 10 million years. It means that when we see a star, we see its shape that was 10 million years ago and that the current moment is, in fact, the moment that existed 10 million years ago. But distance between these two moments is 10 million years. Where have these years gone? It transpires that these years are just a way of knowing and observing. This divides a moment into 10 million years. If this way of knowing and observing sees 10 million years old moment in the present moment, it could see in the present moment the moment which will appear 10 million years later. It is, therefore, established that from beginning till the end—all that time and distance—is just one moment which has been divided into stages which exist from the beginning till the end . We call this division, space"

In the book, *"Nazariya Rang o Noor"* it is stated that ,

"Universe is moving in two directions: 1) time and 2) space".

Space means spread and spread means continuous movement. Every creation is a constant movement. Movement or space functions under time whereas a Sufi views everything without the medium of eyes. He views without a medium of metal or any other thing. Not through metallic Hubble Telescope since whatever was viewed through matter it was not seen directly through eyes but it was the medium which viewed and we viewed what the medium viewed.

It can be understood by yet another example. When we view our reflection in the mirror we do not view it directly. Rather we view the viewing of mirror.

Development of modern technologies to understand visible and invisible lights has opened up new horizon of understanding on the basis of which new theories have been developed. Data and statistics

The Universe

When we view our reflection in the mirror we do not view it directly. Rather we view the viewing of mirror.

Our galaxy, Milky Way, consists of several constellations of stars and their systems spread across the galaxy randomly as bright spots. These systems maintain stability through a force of attraction. These random bright spots in the galaxy are called Nebula. With progress in science, telescope's power of observation also increased. By the help of one such telescope which is installed at Mount Wilson, California, the astronomer Hubble indicated that Nebulas were not part of Milky Way but they are part of yet another galactic system which exists on its own. This disclosure has negated many old theories.

After new observations, experts also gave multi-layered theories to prove that Nebulas exist at some distance from each other like our solar system in which planets move at the distance of several billion km in orbital movements.

Nebulas appear at the same level since we view them from distance. When one of the Nebulas "Virgo" was studied in detail, it transpired that it was a series of several galaxies outside our Milky Way. What is the relation between these galaxies and how do they remain stable in the system are questions whose replies are yet to be discovered.

The author of the book "*Qalandar Shaoor*" Khwaja Shams al-Din Azeemi says,

"Universe and its manifestations are moving in a circle all the time. And all these manifestations know each other through exchange of thoughts. Science has named this relation as energy".

According to experts, galaxies are spread across the Universe like pieces of spring which are connected with each other through forces of attraction despite presence of space between each other. One of these pieces is called Sloan Great Wall. The distance between these pieces is gauged through Red Shift which is basically difference in the brightness of red colour in lights coming from far and near objects. The frequency of light coming from remote object is different from the one coming from an object that is near. Deep red colour indicates higher frequencies while light red colour indicates change in frequencies. With new technology, a 3D model of various celestial objects could be developed by using the lights being emitted by them. The Red Shift technology has helped scientists develop a 3D model of 93 billion Light Years perimeter of Universal system. Due to ever expanding nature of Universe, we get information about destruction and birth of new galactic systems. According to

of diseases, fear, distress, terrorism, disagreements between religious leaders, the disrespect of faith, killings in mosques, disobedience of parents, bribery, not measuring to the full, artificial shortage of goods, adulteration, and immorality is at a higher peak than that of times passed.

Now, no prophet will come to warn us about our ill actions and their consequences, but the system of God is complete and integrated. The ways of God do not change, nor is there any disruption in it. Indeed, Prophet Muhammad (PBUH) is the proposer of forgiveness and mercy to both realms, but he follows the system of God.

With the current state of religions, and creating varying interpretations of Islam to defame it, mankind is doing nothing but openly asking for the wrath of God.

It is the duty of religious leaders, intellectuals, and of those who contemplate – men and women – to first correct themselves, and then draw attention of their families, clans, nations, and then the whole human race, that history always repeats itself. God forbid that we are struck by His wrath, as then, we may be unable to do anything about it.

I repent to God for all of my sins and turn towards Him

One day a man came to the sufi master and said, "I have come here to tell you a very strange thing about your friend that I have heard from his neighbour."

"Wait a minute," the master replied, "Have you made it sure that what you are about to tell me is true?"

"No, I actually heard about it, and thought to bring it into your knowledge." The man replied.

The master said, "And is it something good that you are going to tell me about my friend?"

"No. It is not. It is something very bad." The man replied.

"Hmmm…You have no idea about the legitimacy of the information that you want to pass on to me, and that too is not something good," the master continued, "How something of that sort would be useful to me? Why tell me something that is neither true, nor good, nor even useful?"

The man got silent and after a while thanked the master for teaching him a great lesson.

Dear readers, most of the times we indulge in gossips that does good to no one. We laugh discussing weaknesses of others, but if we become a subject of their discussion, we do not feel good about it. Why do we choose those things for others we do not like for ourselves?

of the strong to cease; and their holy places shall be defiled. Destruction cometh; and they shall seek peace, and there shall be none. Mischief shall come upon mischief, and rumour shall be upon rumour; then shall they seek a vision of the prophet; but the law shall perish from the priest, and counsel from the ancients. The king shall mourn, and the prince shall be clothed with desolation, and the hands of the people of the land shall be troubled: I will do unto them after their way, and according to what they deserve, I will judge them; and they shall know that I am the Lord."

(Old Testament, The Book of Ezekiel, 7:23-27)

King Nebuchadnezzar

Around 550 BC, King Nebuchadnezzar attacked Jerusalem with full force. Out of fear, the Jews locked themselves in their fort. This siege continued for seven years and during this time, all supplies to the city were cut off. A severe drought had struck, and this epidemic spread all over.

Eventually, one night, the people attempted to flee, but the army of Nebuchadnezzar chased and killed them. There was blood all over Jerusalem and *Bait al-Maqdas* was severely damaged. King Jehoiachin was arrested and Nebuchadnezzar made him witness his sons being slaughtered before his very eyes.

King Jehoiachin's eyes were then cut out and he was taken to Babylon in chains.

It is attributed to Hazrat Abd Allah ibn Abbas (RA) that he said, "A huge number of people refused to uphold the principles of faith, or fight for it. They flee out of fear of death and hid in a valley, far away. God did not like this and death took them."

When Prophet Ezekiel (PBUH) was travelling through that town, he felt sorry for the dead and so made a prayer for the deceased. God accepted his prayers and all of them were brought back to life.

"Bethink thee of those of old, who went forth from their habitations in their thousands, fearing death, and God said unto them: Die, and then He brought them back to life. Lo! God is a Lord of Kindness to mankind, but most of mankind give not thanks."

(Quran, 2:243)

In the Bible, Prophet Ezekiel (PBUH) has prophesied about the coming of the honourable Prophet Muhammad (PBUH).

Prophet Ezekiel (PBUH) spent the last days in Babylon, and passed away there. His blessed grave is near the river Tigris.

Wisdom:

Hatred, jealously, lust, earning without any regard for lawful means, arrogance, doubts, pride, injustice, prejudice, shedding blood, the ever-growing number

Prophet Ezekiel (PBUH)

"It is the duty of religious leaders, intellectuals, and of those who contemplate – men and women – to first correct themselves, and then draw attention of their families…"

In Arabic, Ezekiel means "Mightiness of God". Prophet Ezekiel (PBUH) was known as *Ibn al-Ajoz* in Israel, which means 'son of an old lady.' His father passed away when he was quite young, and his mother had turned very old by the time he was blessed with prophethood.

When Prophet Ezekiel (PBUH) was appointed, insurrection and disobedience was quite common. Pride, arrogance, and the sense of superiority had rusted people's minds. Self-interest, favouritism, deceit, jealously, envy and hypocrisy were a part of everyday life. The people would take pride in performing shameful and immoral deeds, and defended their injustices with reasoning, feeling content after performing cruel activities.

What their fathers and forefathers did had become their religion. There were so many sects that it was not possible to count them all, and the religious leaders had become the authority over religion. The belief that God is one was replaced by polytheism. The eyes and ears of the sinners were sealed as their hearts were veiled, and there no longer remained any concept of God in their minds.

In such difficult times, Prophet Ezekiel (PBUH) preached the oneness of God, informed his nation about the core of faith, advised them to adhere to truth and righteousness, and also instructed them to avoid committing bad deeds. He addressed his nation and said,

"Stop committing sins and adopt the true path, else God's wrath will descend upon you."

The nation paid no heed to his preaching, and remained persistent in their ways. People mocked him and found ways to cause trouble to him.

As per the laws defined by God, Prophet Ezekiel (PBUH) prophesised to his nation about the expected punishment and horrible destruction that was to descend upon them when he observed that they were not willing to join the straight path, and that their hearts had been sealed.

The prophecy of Prophet Ezekiel (PBUH) is mentioned in the Bible, Book of Ezekiel, which was fulfilled word for word, in the time of king Jehoiachin.

"Make a chain: For the land is full of bloody crimes, and the city is full of violence. Wherefore I will bring the worst of the heathen, and they shall possess their houses: I will also make the pomp

its natural flow.

The famous martial artist, Bruce Lee, explains this concept with the following:

"Be like water, making its way through cracks. Do not be assertive, but adjust to the object, and you shall find a way around or through it. If nothing within you stays rigid, outward things will disclose themselves. Empty your mind, be formless, shapeless, like water. If you put water into a cup, it becomes the cup. You put water into a bottle and it becomes the bottle. You put it in a teapot, it becomes the teapot. Now, water can flow or it can crash. Be water, my friend."

This thought process that began with the braces brought me to harmony with the pain. But did harmony mean that the pain was not there anymore?

It was there, but for me, it was not. Life, along with all its essentials, moves on with its own course. Out of all those things, only what we deem important, exists for us. If something is ignored by someone, it ceases to exist for them and only when they focus on it, does it come back to them. Have you read that story in which a granny who was looking for her spectacles in a room but ignored herself? She was wearing them, but as she did not think she was, they became invisible to her.

How many times have we unheard someone calling us? Where we were so absorbed in some activity that despite hearing the voice, we somehow did not hear it? How many times have we failed to notice the presence of someone near us? Small experiences, when pondered upon, unearth vital realities of life. Such as:

- God is everywhere, but we do not feel his presence.
- There is somebody within us who is guiding our material body to move, yet we do not see it.
- The sound of *Kun* (Be) is reverberating even to this day, but we have turned a deaf ear to it.

God says that those who are close to Him, believe that everything is from Him. The lives of holy prophets and friends of God are replete with examples that they did not fight against the time – they lived through it. They had firm belief in God that helped them see a wider picture and accept things as they were.

The gist of one of the verses in the Quran's Chapter Al-Imran says, "It is the norm of prophets to fight the non-believers. They have been afflicted with miseries even before, but they never turned hopeless. They were successful because of their perseverance. And God loves those who are persistent."

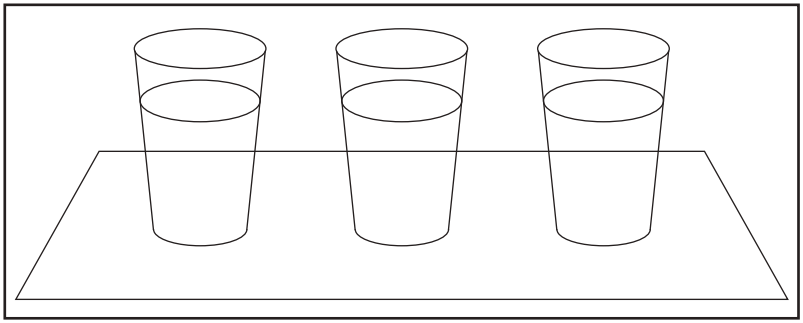

the third glass, with once again a gap of two minutes, recite *Surah Ikhlas* (Chapter Ikhlas from the Quran) along with *Bismillah* (In the name of God), and blow on the water thrice. Now look closely at the three glasses, the water within them is no longer the same. To view it better, you may also use a magnifying glass.

Water – like every other organism – senses things. It sees, listens and understands. When it was told how productive it was, the words brought change to it accordingly. But when negative things were said to it, it adapted and consequently, negative traits transferred into it.

I learned through this experience that water is a creature and like every creature, it accepts and adapts to information. Not only that, water moulds itself according to the environment and has the tendency to make its way out of a difficult situation; be it a mountain, a great hurdle, a narrow passage or no passage at all, when there is no path, water finds a way around it. And if that is not possible, it keeps striking and knocking until a crack appears.

The water in our body has the same tendencies as the one found in rivers, streams or the sea etc. It reacts in the same way within us as the water in the glass did after imbibing the energy that the words contained.

Our body is composed of 1/3 of water, therefore, the nature of water dominates us. The kind of information we let it absorb is the kind of reaction it will show.

For instance, when the braces and retainer were first introduced to me, my reaction towards it was fidgety and that stirred the water in my body, disseminating a feeling of unease throughout my veins. By the time I realized there was no way I could get rid of them, I came to terms with them.

The sense of being comfortable with them invigorated positivity and sent this message to every atom of my being that everything was fine. Uneasiness was replaced with ease and the water regained

mouth to see if it was deformed, but the shape was fine and still fitted as it should. I concluded that it was applying the same amount of pressure as it was earlier – but then what had changed?

My thoughts drifted into the past and I recalled the time when the braces stopped hurting me after the first four months. Once, while checking how firmly they were fixed, I touched my tooth, and felt a sudden surge of pain, pressure and subtle vibrations. It occurred to me that the tooth must have been under a lot of pressure and latent strain that a mere touch brought forth pain. If the pain was there, why did it lay dormant? I was struck with the realisation that nothing had changed… it was I who went through the transition.

The great Urdu poet, Mirza Ghalib, has alluded to this phenomenon as follows:

Ranj se khoogar huwa insan to mit jata hai ranj;

Mushkilen mujh par parin itni ke asan hogain

Translation: When one becomes used to grief, grief-it ceases to be, and so many hardships fell upon me that they became easy.

The retainer was doing what it was designed to do. The change occurred at my end. When I accepted the pain, it stopped hurting me – this was the gist of my musing.

This awareness brought a smile to my face and I resonated with the fact that the moment we embrace anything and the minute we stop resisting, it is then that we liberate ourselves from misery. It also taught me that when we accept people and circumstances the way they are, we set ourselves free from them. Since we have no control over the sequence of how life unfolds itself to us, then why the hassle? After a certain period of time we get used to things we first could not conform to. How does this happen?

What is it in our nature that adapts to everything? It is because of the element of water!

What does water have to do with the pain, happiness and discomfort in our lives?

If you praise someone, streaks of joy will present themselves all over their face and when you talk down to them, they will show the opposite reaction. Why? Let's understand this through an experiment.

Experiment

Keep three clean glasses on a white piece of cloth or white art paper (36 x 23 inch), at a distance of six inches from each other. Boil some water, and pour it into the glasses after it has cooled down, making sure that they are not filled to the brim and a part of them is empty from the top. Now say negative things to the water in the first glass for as long as you can. After a pause of a minute or two, praise the water in the second glass and explain how beneficial it is. When you move on to

Braces, Teeth, and I

When we accept people and circumstances the way they are, we set ourselves free from them. Since we have no control over the sequence of how life unfolds itself to us, then why the hassle?

About three years back my dentist advised me to wear braces to fix irregularities in my teeth. I agreed and within the next week, I was wearing them. This initial week, with unfamiliar brackets, arch wires and bands, was really tough. The pain it caused was terrible, the strain it applied made me fidgety, and trying to chew anything in the first three days was very difficult. It brought about a prominent change to my face, though not bad, for weeks the face I saw in the mirror appeared to be that of a stranger. Those who spoke to me would not look into my eyes; their attention would always drift to the braces. For roughly a year, I had to constantly explain why I was wearing them to my acquaintances.

In a short time (it did not feel short then) it became part of me. Fast forward…after three years of frequent visits to the dentist, the braces were finally taken out. I felt light but strangely different. Why? Because something that I was familiar with was missing from my mouth.

The change was great, but it did not last long as the dentist informed me that I was to wear retainer. In certain cases when braces are removed, teeth move back to their initial position, but a retainer can curtail the movement. Having no choice, I had to go through this experience thinking that it would be less troublesome than the braces.

But the day I wore them, to my surprise, I forgot the pain the braces gave me. The expression of unease was so prominent as the dentist had me wear my retainers that he said, “You will be fine within four days. Make sure to wear it most of the times, especially while asleep.” I nodded, but in my head, I was calculating the hours that four days contained. By the time I reached home my eyes were teary and I had a headache due to the strain.

The retainer was transparent; thus, it was invisible to all, even to me. It applied a huge pressure as if a tug of war existed between my jaw, teeth and bones against the retainer, yet none of them wanted to budge from their position, making me miserable.

On the third day, the pressure was released and the pain evaporated into thin air as if it had never existed at all. The retainer that I had hated two days back began to feel good. This sudden transition was exhilarating yet raised many questions. Did the pain go away or had I become accustomed to it? I took the retainer out of my

Clay is kneaded with beads of water. They are so well integrated within each other that one cannot distinguish between the molecules of water and clay. The sacrifice of water within every particle of dust shapes this universe. While the visible part of existence is clay, the invisible part of every existence is water.

One sees a fruit and only feels the water as juice within it when they bite it.

One sees a tree and only feels water when resin starts leaking out of the wounded barks.

One sees the cloud soft and fluffy and feels water only when they burst open as rain.

One feels their body to be dry until the pores of their skin break open to sweat.

Water, who is the base of everything, has made her self the hidden aspect of existence. Why? In this world where everything and everyone wants to be noticed and appreciated, why is water happy to go unnoticed? Why does she not wait to be appreciated for her constant state of sacrifice?

Then something clicked inside me. Was she not learning and following the traits of our beloved God? He is the creator of everything. He flows in everything as *Noor* (Divine Light). He remains constantly in service of everything He has created, not once looking for validation for the mercies meted out to us.

Water was meticulously following the order of God. Flowing seamlessly through everything He has created. Serving everyone as He has ordained. Working selflessly, without wanting anything in return. Despite being in all, she remains the hidden aspect, and lets the layer of dust shine through her as the identity of all.

The more I thought of her, the more her existence intrigued me. I decided to let her know what I felt. But that day, I was dropped and I broke into pieces. Eventually, I was nothing but dust. But she and I met again in another dynamics. She poured over me every morning and evening and I dissolved each day as topsoil, and even let a tiny sapling grip me with its roots.

I was becoming the unseen too, like my beloved water. I was going to be the foundation of a tree, and would remain unknown and unseen.

Finally, I was getting an opportunity to live and feel how it is to be, unseen like her.

Even after all this time, the sun never says to the earth, "You owe me".

Look what happens with a love like that. It lights up the whole sky.

Hafiz Shirazi (RA)

how life birthed out of the earth survived and stayed nourished – the soul behind it was of course, my beloved water.

Sometimes I am lost in her beauty. I love to see her on a leaf as the morning dew. She sparkles like a diamond. And then when the wind teases her she is happy to slip off the leaves, sliding down the stems, and falls to nurture the dry roots. I have never seen her live for herself. Even when she is left untouched, she is constantly serving everyone around her.

I remember when once, everyone had left on a vacation. I was alone with her within me. They had forgotten to remove me from the edge of the porch. The sun began to shine down upon her and I saw her evaporating into the sunlight. I wondered what would happen to her. I saw her going higher and higher until she found a safe space in the clouds. Before I could even miss her, she was back, falling upon the roof and the garden as rain. I have never seen her afraid to do what she needs to do. Never once have I seen her question her existence or why she was never allowed to rest.

I have seen people frown upon her when she allows herself to stagnate. They thought she was ugly. But I knew she was not. In being stagnant, she helped a lot of moss to grow within her and she also helped insects lay their nests. I have never seen her defend herself in the wake of ugly comments upon her. I have seen her being shunned as she flowed in the drains. She was the one who constantly flowed and cleaned that garbage that left unchecked would cause diseases. But no one saw her sacrifice.

I was a clay pot. On my own I was nothing. Just dry soil. But when I had her within me, I transformed into this wonder maker. I knew I could be her partner in service if I supported her every action. If I let go of my focus on my body of clay and focused on the divinity of the water within me, I would be part of the marvels she performed.

Just as I made the resolve of focus, I heard a melodious voice recite,

“Verily We created man of potter's clay of black mud altered.” (Quran, 15:26)

“God hath created every animal of water. Of them is (a kind) that goeth upon its belly and (a kind) that goeth upon two legs and (a kind) that goeth upon four. God createth what He will. Lo! God is Able to do all things.”

(Quran, 24:45)

I did not know how I had forgotten. I was not just beholding her inside me, but I was also made from her. I was elated and beyond ecstatic. It began to dawn on me that the reason I was so fond of her was because she was an integral part of me. I began to contemplate.

make her way to the drain. She was not attached to her tasks nor the results she gave. She just did her job and left.

On another instance, a traveller who had been travelling on foot over two days fainted at the gate. They ran, holding on me and poured her out into a glass. Gently sprinkling her over the traveller's eyes, they revived him. And then I watched as he gulped a whole glass of her down.

I saw how she had the miraculous power of healing and reviving people by quenching their thirst. In no time, the traveller was on his way, thanking everyone profusely for saving his life. He did not seem to thank her for he never realised her role in his well-being. But was she bothered? No! She was untouched by the good she had done through her.

Another day they left her filling into me and forgot to turn off the tap. I was overflowing and she had formed a beautiful puddle in the mud. She managed to catch the attention of a crying child and within no time, he was laughing with her. The child ran off to get some paper boats and started relaying stories of pirates and heroes to her. She sat there in silence, listening without uttering a word back. In no less than a few minutes, she had completely changed the mood of the child and had made him happy.

Do you know I saw my first rainbow of colours through her?

I saw that she had fallen off my rim as I was placed a little tilted. Before I could worry, I saw a drop of her settling on the floor. A ray of sunlight seemed to beam right at her. And just then, I saw her bursting into a splendour of innumerable colours - red, orange, yellow, green, blue, indigo and violet. She had an entire rainbow hidden in just a drop of her!

I remember when a very old lady came to visit our home. She was constantly tired and had swollen feet. The village physician suggested we soak her feet in warm water and salt. Instantly they poured her out of me and warmed her up. They then added a fist full of salt and let the old woman soak her feet in it.

I do not know how happy I was when I saw that the swelling had completely subsided and that the old woman was happily back on her feet.

The coconut trees around the house, the mango tree in the backyard, and the bed of flowers on either side of the front gate all will vouch for her magical powers. She falls on them every morning and evening and magic unfolds. Sprouts, flowers and fruits grow. The pollen grains that fall off the legs of the bees await her to shower upon them.

I have seen the surprise in the eyes of those who visit us when they see new species of plants growing in the garden every single day. No one except me knows

The Clay Pot and Water

Water was meticulously following the order of God. Flowing seamlessly through everything He has created. Serving everyone as He has ordained. Working selflessly, without wanting anything in return.

I am clay. I perforated through rocks and slid down as red mud. Then one day, he came into my life and shaped me into a pot. I do not know how I look but I sometimes look at the reflection of me in his eyes and think, "This must be me."

It was not easy to be kneaded, rolled out on a spinning wheel and then shaped into a pot. I was baked under high temperatures. The painful process toughened me. I was fragile yet strong. He tapped upon me many a times to check if I was ready. I loved the sounds that came out of me as he did so. I wondered what I would be used for? Would I be used for melodious songs? Would I be used as storage?

Then one day I met her – she was called water. When they poured her inside of me, I felt an instant magical connection. I saw her as kind and very useful to everyone.

When a little water poured out of me and on to the roots of plants, they grew stronger and taller. When they scooped her out of me into their palms and sprinkled her on seeds, they sprouted. When they dispensed her out of me into little bowls, birds and animals quenched their thirst. When she was drizzled over a plate of flour they kneaded it into dough for bread. When she was swept over dirt, the area sparkled clean. When they splashed her over themselves for a wash, their bodies smelled fresh and fragrant. When they used her for cooking, aromas filled the room. When they used her to fill the little pond, the fish swam around in glee.

I was so in love with her, but unable to hold on to even a single drop of her, even though she was within me. It was as if every drop of water emptied into me was not for me to behold and possess, but it was to be used in the service of others. I have seen her sacrifices and it has often warmed my heart.

One day, I watched her being poured out of me before being heated. I watched her patience. I never once heard her protest or cry out in pain. They gently brought her to a certain temperature and poured her over the body of a newborn. It was the infant's first bath!

The baby at first cried not knowing what it was in for. But soon her soothing effect was upon the baby and it began to relax. All watched in awe as the baby went off to sleep as they poured her over the infant, over and over again on its tender skin. I saw her silently drip down the skin and

fear, contemplate habitually, and are free from illusions.

A disciple once expressed his desire to stay with Hazrat Sahl (RA). Hazrat Sahl (RA) replied, "The company of a cognisant person is indeed better than all other exercises. But tell me, whose company would you seek after mine?" The disciple replied, "The company of God." Hazrat Sahl (RA) replied, "Then adapt to His company now."

This account describes that one must do those things now that introduce them to God. To be close to a friend of God is not simply being near to them, but it is working through a complete program on how to follow the commands of God.

Hazrat Sahl (RA) often used to say, "O' God! It is a source of happiness to me that You remember me even when I am not worthy of it."

The blessings of God's friends is for all, beyond caste or creed. They show people the path to God. It is narrated that Hazrat Sahl bin Abd Allah al-Tustari (RA) had a follower who was a Zoroastrian. Before Hazrat Sahl (RA) passed, he had prophesised that his successor would be a person who would give up worshipping fire and accept the true faith.

A couple of days before Hazrat Sahl's (RA) passing, he asked for the said disciple and advised him to deliver a lecture after the noon prayers on the third day after his departure from the physical realm.

When people heard of the passing of a great saint, they came to attend his last rituals from near and far. A non-Muslim heard of this news, and he too joined the others with a desire to see this saint's face.

After seeing Hazrat Sahl's (RA) bright and illumined face, he asked others with him, "Do you see what I see?"

They asked, "What do you see?"

He replied, "From the heavens, many groups are descending and there is light all around his body."

What he saw left a deep impression on his heart and he recited the *kalima* (first creed / testimony of faith for Islam) and embraced the faith.

This man, about whom Hazrat Sahl bin Abd Allah al-Tustari (RA) had foretold before his passing, came on the third day in his religious dress and from the pulpit he announced, "Our spiritual mentor has selected me as your guide and has advised me that the time has come for me to give up fire worshiping. Therefore, I give it up, and by considering God a witness, I embrace Islam. There is no god except God and Muhammad (PBUH) is His messenger."

---

remembers God is at a stage of reality. It is not surprising if they decide to bring the dead to life, as they can do it as per the will of God."

It is said that during this time, Hazrat Sahl (RA) placed his hand on an ill person who became well there and then.

These are not merely stories of wonder workings, as there is knowledge behind every wonder working. The universe becomes subservient to those who have the knowledge to transform the creatures. The knowledge to transform things is not possible without knowing the fixed quantities and proportions. On this matter, the holy Quran says, "Praise the name of thy Lord the Most High, Who createth, then disposeth; Who measureth, then guideth." (Quran, 87:1-3)

What are measured proportions?

"God has made everything with specific proportions (atoms). They are the capabilities active in the apparent and the concealed aspects of a thing that are sustained under the supervision of a single Entity, under a fixed principle and discipline. Huge celestial bodies, ordinary and small atoms, and internal layers or components of atoms – electrons, protons, and neutrons – are all visible to the One God. Any particle, whether small or big, is not outside the control of God."

(Book: *Ahsan O Tasawwuf*)

Hazrat Sahl (RA) used to advise his disciples, "*Tawakkul* (Trust in God) is the most favoured action of prophets and it is mandatory for the believers to follow in their footsteps. *Tawakkul* means to consider oneself a dead body before God – the One that is cleansing them. A sign of trusting in God is that one must not ask or expect anything from others. If someone gives them anything, they should give it away in the name of God, and remain content in all situations."

In reply to a question by a disciple, Hazrat Sahl (RA) said, "The path to God eases when one mends their ways, and believes in the will of God. By accepting it wholeheartedly, one is rid of diseases and troubles."

Elucidating the golden principles for life, Hazrat Sahl (RA) says:

- Follow the examples of Prophet Muhammad (PBUH).
- Earn lawfully.
- Be sincere in your actions.
- Avoid causing harm or trouble to the creations of God.
- Be prompt in fulfilling rights.
- Adopt the great attribute of responding to evil with goodness.
- Be patient during sickness or hunger.

Sufis are close to God, free of

Merciful." (Quran, 49:14)

Someone once wanted to know the meaning behind a claim he had once heard from a man that said, "I do not search for provisions without a command."

Hazrat Sahl (RA) replied, "This must be said by a *Siddique* (a person who speaks truth). Even a single leaf does not move without the will of God. Everything on the earth and in the sea, is bound to His commands. Everything descends and ascends by His command. Would the man look for food without hunger? Striving for provisions is an order from God and he works hard to follow God's commands. Earning provisions through legal means is a form of worship, as solitude cannot be perfected until provisions are lawful."

He further said, "Eating once during the day and night is the practice of *Siddiqueen* (people who speak truth). Eating twice is the practice of *momineen* (true believers) and eating thrice is the work of those who like to graze. Furthermore, eating to one's fill makes them a slave of their egoistic desires."

Hazrat Sahl bin Abd Allah al-Tustari (RA) advised his disciples, "Eat less and avoid excessive talk as silence is solitude in the crowd, and eating less is a form of protection. Eating more causes physical, mental and ethical diseases. To attain sincerity, control over one's self is the best stage for a disciple, as it is the most difficult to achieve. The meaning of sincerity is using the qualities blessed by God as per His Will."

Hazrat Sahl al-Tustari (RA) once described a dream of his, "I saw that I was in the heaven. I met with some pious people there and asked them, 'What was most important to you in the worldly life?' They replied, 'To follow the commands, and die as a believer.'" Later he described another dream, "I saw Satan in a dream and I asked him, 'What disturbs you the most?' He replied, 'The conversation between a person and God.'"

Hazrat Sahl (RA) said, "Once, I came across Satan. I said to him, 'I won't let you go until you tell me about the Oneness of God.' Satan elucidated the stages of understanding in a manner that no other cognisant individual can. Even then, I wasn't impressed, for he uses this knowledge to misguide the people."

A disciple said, "At times during ablution, the water touches my body and turns into gold and silver." Hazrat Sahl (RA) replied, "When children cry, they are given toys to play with to calm them down."

On the topic of the remembrance of God, Hazrat Sahl (RA) said, "Indeed, the person who

datory, and one must not answer in their presence."

When the matter was investigated, it turned out that Hazrat Dhul-Nun al-Misri (RA) had passed away.

The ruler of that time once fell ill. When his sickness would not let up and continued to worsen, the doctors all gave up. The ruler requested that Hazrat Sahl (RA) pray for him.

Hazrat Sahl (RA) said, "Prayer works for those who repent. Seek forgiveness from God and release the prisoners." The ruler followed the advice, and so Hazrat Sahl (RA) made a prayer, "O' God! As you have showed him the lowest tide due to his sins, please now show him the greatness of worship too."

The prayer was accepted, and the ruler gained his health. He tried to give Hazrat Sahl (RA) a reward, but Hazrat Sahl (RA) excused himself and left.

A disciple who was with Hazrat Sahl (RA) at the time said, "I have had many debts for quite a while now. Had you accepted the reward, it would have helped me."

Hazrat Sahl (RA) replied, "If you want to see piles of jewels, then look ahead!" There was gold everywhere before them.

Hazrat Sahl (RA) then said, "Why would anyone desire anything else when God has opened His doors for them?"

It was time for Friday prayers. A man desired to offer prayers in the central mosque, but the trouble was that it was miles away. Hazrat Sahl (RA) held his hand and in the next moment, both were at the central mosque.

The man was shocked but remained quiet as he already had a deep reverence for Hazrat Sahl (RA). After the prayer, Hazrat Sahl (RA) glanced over the people and said, "You will find many who expose others, but sincere and true believers are few."

There are many lessons in this account. God's friends have knowledge of the formulas of time and space, and through their will, they travel across great distances with the power of their thoughts in no time. By crossing the distance of 24 hours in an immeasurably small timeframe, does the existence of the 24 hours not become questionable?

What Hazrat Sahl (RA) said regarding the scarcity of true believers is indicative towards the following verse from the holy Quran that draws a distinction between a Muslim and a *momin* (true believer).

"The wandering Arabs say: We believe. Say (unto them, O Muhammad): Ye believe not, but rather say `We submit,' for the faith hath not yet entered into your hearts. Yet, if ye obey God and His messenger, He will not withhold from you aught of (the reward of) your deeds. Lo! God is Forgiving,

ferred to work hard instead of asking anyone other than God.

It is said that during the travel he met an old woman and wanted to help her. The woman scooped sand into her hand and opened her palm before him – in the place of the sand, there was now gold. She said, "You take money out of your pocket, but I get it from the *Ghaib* (Unseen)." With that, she disappeared.

Hazrat Sahl (RA) reached Mecca and performed *Hajj*. During circumambulation of the *Kaaba*, he saw the old lady again. He realised that she was on a higher status than him and went close to her. The lady said, "Circumambulation is a must for those who reach here intentionally, but those with passion in their hearts are called by the *Kaaba* itself."

Later, Hazrat Sahl (RA) pledged allegiance to the revered Hazrat Dhul-Nun al-Misri (RA). After staying with him for a short while, Hazrat Sahl bin Abd Allah al-Tustari (RA) returned to his home town on his mentor's command.

Hazrat Sahl (RA) never rested his back against the wall, spread his legs, nor answered any questions. Once, his toes hurt for four months, but he did not disclose this to anyone and quietly bandaged it. A person visited him and questioned the bandages, but Hazrat Sahl bin Abd Allah al-Tustari (RA) remained quiet.

After some days, the same person went to Egypt and visited Hazrat Dhul-Nun al-Misri (RA) and saw that his toes too were bandaged. He was surprised and asked about it. Hazrat Dhul-Nun al-Misri (RA) said, "There has been a pain in them for the last four months." The man was surprised, and said that he had seen bandages on Hazrat Sahl's (RA) feet before he had come there. Hazrat Dhul-Nun al-Misri's (RA) face turned red with love as he said tenderly, "There is no one other than Sahl who follows me so genuinely and feels my pain."

This story tells of the strong connection between a spiritual mentor and disciple despite spatiotemporal limits. They were both aware of what the other was going through despite living far from each other.

One day, Hazrat Sahl bin Abd Allah al-Tustari (RA) appeared very sad. People asked him about it but he remained quiet. The next day, people saw him unusually sitting against a wall. Everyone was surprised, but no one had the courage to ask about it.

Hazrat Sahl (RA) addressed them and said, "You all used to ask me a lot of questions. Now you can ask me whatever you would like to ask." Someone said, "Sheikh, till yesterday, you wouldn't answer our questions. What brought about this change?"

Hazrat Sahl (RA) replied, "When ones' spiritual mentor is present, respecting them is man-

A Conversation with God

"Eat less and avoid excessive talk as silence is solitude in the crowd, and eating less is a form of protection. Eating more causes physical, mental and ethical diseases…"

One day, a little boy said to his maternal uncle, "I have been bowing down before the *arsh* (throne of God) since eternity."

The uncle was surprised to hear this from his nephew, and so advised him to remain cautious while conversing with other people, and instructed him to recite a prayer before going to bed, every night.

The child grew up and became a famous Sufi. He is known as Hazrat Sahl bin Abd Allah al-Tustari (RA). His uncle, Muhammad bin Samar (RA), who himself was a Sufi, took him into his care when he was orphaned at a very young age.

Like any other pious person, Hazrat Sahl al-Tustari's (RA) childhood was spent around in good activities. Since a very early age, it was ensured that he was brought up with the best of ethical principles, and the very first principle of ethics is that one must thank God for His countless blessings and bounties.

The mind of a child is like a blank sheet of paper. The early impressions on it are long lasting, and those impressions then become a means through which they see things.

Hazrat Sahl al-Tustari (RA) was taught to be kind, to be grateful to God, and to love God and His messenger – Prophet Muhammad (PBUH). Hazrat Sahl (RA) had a balanced diet and avoided sleeping for long hours. When he stepped into his youth, there wasn't a single night he missed praying. He said, "I still remember my answer, 'Indeed! You are our Lord', when the Creator of the Universe asked, 'Am I not your Lord?'"

The statement shows that when one remembers God persistently, it turns into an observation, the acknowledgement of the pledge made to God is reinforced.

There were those who were envious of Hazrat Sahl (RA). After many attempts to appease them, when he saw that they would not mend their ways and their evil doing increased exponentially, Hazrat Sahl (RA) decided to migrate from Tustar. He distributed his wealth and began his journey towards Mecca with the intention of performing *Hajj* (Islamic pilgrimage).

After a tiresome journey, he reached Kufa and felt hungry. He saw a camel near a mill and sought work for a day with the owner of the mill for one dinar as a wage. He worked till the agreed time, had some food and continued his journey. He always pre-

V

the reflection of food emerges once more. Why does the desire for food resurface when hunger is sated, and despite eating wheat, why does the wheat not cease to exist?

• • ——————————— • •

The stages – *Wahima* (perception), *Khayal* (thought), *Tasawwur* (conception), *Ehsaas* (sensation) and *Mazhar* (physical form) – are all a concatenation of information. Information displays on to the inner screen from an unknown plane, but we deem it to be outside of ourselves. This thinking pattern diverts one's attention from the inner self and focuses only on the surface of things.

Rather than concentrating on entities one by one, if we focus on a uniform element (light) among them, this will centralize the faculty of sight on one point, which is otherwise divided on multiple levels. Unless this approach is adopted, one cannot enter into the realm of *wahima*. The basis of *wahima* is information, and the source of information is that station or level at which creatures are recorded in the form of images. *Wahima* is an initial step towards consciousness, and that is why if one becomes aware of the working of information inside of them, the constraints of the corporeal world break apart and paradise becomes their abode.

• • ——————————— • •

Honourable ladies and gentlemen, and my dear children!

Eid is a gift from God to embrace *Laylat al-Qadr* (Night of Decree) during Ramadan. Those who seek knowledge of the world within and give less importance to all other things, embrace true happiness. Festivals are a great source of celebration that helps free oneself from worries and mental restraints. As the Almighty God says,

"Lo! verily the friends of God are those on whom fear cometh not, nor do they grieve." (Quran, 10:62)

Happiness is when one feels the waves of contentment within. When two people hug each other with love and sincerity, they harmonise themselves with happiness.

Assalam O Alaikum – May God's blessing be upon you.

Eid Mubarak – May good fortune remain with you.

Give *Eidi* (gifts) to children on my behalf. How much you wish to give is your choice.

May God protect you.

serving is followed by all creatures in the universe.

• • ——————————— • •

An action is propelled by a thought, and thought is always neutral, but people derive their own meanings out of it. For example, when a thought to provide food occurs, this information is boundless as the emphasis is only upon serving food. It does not contain the details as to whom we should feed, how many we should feed, or even what we should feed others with. If one begins to follow this line of questioning, and tries to create distinction from boundless thought, this is in fact going against the nature of the thought itself. There are birds, insects and other creatures present in the surroundings. Every morsel of food is destined to who will receive it. Accepting this information to provide food in its true form would be to feed others with what they have, irrespective of who is present.

• • ——————————— • •

Re-read this 'Message of the Day' for profound comprehension.

1. The first stage of information is *wahima*, which entails subtle forms and features.
2. When pressure in *wahima* increases, the lines and features within it begin to show, and it is called a thought.
3. As the thought deepens, colours begin to surface.
4. Colours belong to the world of senses.
5. As soon as the senses overpower, the information takes physical form.

Example: A film recorded in a reel is the reflection of the mind of the producer. When light passes through the reel, it absorbs the images and displays them onto a screen. The screen is a source to display the reflection that is documented in the film. For the images to transfer onto the reel, it is imperative that they exist beforehand. If the film is about trees, it is a prerequisite that trees exist before the film is produced.

Where does the image on the cinematic screen traverse from? If it came from the reel, then where was the film recorded before it was imprinted on to the reel? Actions are guided and repeated in accordance to the information stored in one's memory. In other words, what we see within, is replicated outside. For instance, repetitively thinking about wheat does not reproduce wheat outside. In actuality, thinking about wheat manifests the reflection of wheat. Reflection refers to abundance. Therefore, wheat, despite being singular on the inner plane, seems plural on the outer plane. This is how illusions are created.

Read the above points with concentration.

Explanation: Eating food to satisfy one's appetite brings forth the assumption that the food has ended or been consumed and that the hunger has been sated, but after an interval, hunger pangs strike again, and

paradise before this corporeal world, similarly, *wahima* is a stage that exists before thought. Thoughts are related to *Alam-e-Nasoot* (the realm of the physical world) whereas the world preceding it concerns *wahima*. This shows us that *wahima* is the first ingress into the world of matter.

Humans beings inhabited paradise before coming into this corporeal world. What was the cause that made them leave the realm of paradise? It was the diversion from an infinite mind to a finite one that drove them out. God does not impose His commands, it were human beings who of their own accord accepted a life of hardships by not adhering to what was asked of them, and went astray. Following their own will restricted their senses, which still rule over them.

• • ——————————— • •

Objects, to the confined senses, are visible only when they appear distinct from the whole. This distinction however, melts down at the *batin* (inner), where everything is present in the form of light. The same principle is applicable to *wahima*. At this stage, as information is ingrained in the form of light, it is discernable only when dimensions surface.

An average mind is in an abyss, to the extent that it is incapable of comprehending information, even at the level of *khayal* (thought). Hence more pressure (gravity) builds up to make the impression visible – this is the stage of *tasawwur* (conception). The stage of *tasawwur* is no different than the second phase of thought until one gains full awareness of the components hidden in the information. When one is immersed in *tasawwur*, the information therein assumes form. Taking form or being manifested implies that the object has covered a space as per its potential. God has referred to this state as *asfala safileen* (lowest of the low). Images in this realm appear to the limited senses when light settles down. This is the peak of nearness to restricted senses and remoteness from light As the images appear to the limited senses as the light settles down, the dimensions hidden in the image surface.

• • ——————————— • •

The true station or level for an individual in this corporeal world is the world of *wahima* – the first stage of information. One needs to acquaint themselves with light to enter into this realm. Everything that exists has fixed proportions, which creates distinction between entities. Similarly, light is in proportions too, but due to the process of diffusion, the confined consciousness does not discern light.

The attributes of impartiality and sacrifice in human beings, are in line with the attribute of light. This universe is established on a selfless act of sacrifice. Everything in the universe obliges to the command of God and is altruistically serving others beyond distinction. The sky is a canopy for both good and evil people, likewise, the earth provides a foundation to both the proud and the humble. This principle of selfless

The infinite paradise in its own bounds, is also finite. Manifestation of an idea with the occurrence of a thought is the quintessential attribute of the realm of paradise. But there are other worlds as well that exist before paradise, for the universe is a combination of realms that overlap each other in a multitude of layers. This is explained through the following points. Read through them with due attention.

1. Human beings were somewhere else before they arrived in paradise. Therefore, their final abode is not paradise, but the realm from where their journey began.
2. The intention to create the universe is the second realm for all beings.
3. The third realm is the command *Kun* (Be) from God that brought about the universe.
4. The transition from the command *Kun* (Be) to *Fayakun* (It is) is the fourth realm.
5. The manifestation of creatures, including man, happened in the fifth realm.
6. The question, *"Alastubirabbikum?"* ("Am I not your Lord?") took place in the sixth realm.
7. The seventh realm is when the creatures acknowledged the sovereign God.
8. Adam was blessed with *Ilm ul-Asma* (knowledge of the formulation of universe/ knowledge of the names) in the eighth realm.
9. Adam demonstrated the aforementioned knowledge to the Jinn and angels in the ninth realm.
10. One of the realms is where the angels prostrated to Adam, but Iblees (Satan) refused to do so. Adam then entered paradise.

• • ——————————— • •

As explained before, the first stage of information, when it enters into the conscious level is called *wahima*. If *wahima* were beyond the reach of human consciousness, our consciousness would not grasp it, but it does, and then transforms the information into the second stage.

Wahima amounts to a subtle pressure and pressure is formed due to gravity. Gravity is synonymous to dimensions that is concerned with the width and breadth of an object. W*ahima* is a stage where things do exist in shapes and boundaries, but despite their forms and proportions, one does not feel their existence due to unawareness of the light. These subtle features become obvious when the amount of pressure in *wahima* increases and transforms it into a thought; which is the second stage of information. At this point, the pressure deepens into a subtle sketch that appears on the mind (screen) in the form of currents.

A restricted mind perceives things in the secondary stage of information; the zones prior to it are unfathomable. As there is a realm of

Message of the Day

A trace of doubt or alteration in thought changes the course of one's inclination. That is why it is essential to be centered upon the initial thought to accomplish any task. This does not mean in any way that other ideas should not arise, but their flow should be in sync with the first thought. Synchronization in one's thoughts is attained when the mind is affixed on the original idea, and as a result, information within the subconsciousness begins to surface.

Information descends in stages. When one grasps information in its true form, and does not taint it with their own perspective, it enables them to enter the first stage, i.e. *wahima*. *Wahima* is a subtle pressure that is felt on the mind when information descends. Due to the dominance of light, the impressions at this stage are imperceptible to a limited consciousness. As people habitually see things in shapes and forms, the impressions that are owed to their subtleties go unnoticed by a partial mind.

The intrinsic attribute of an *Insan* (Human), however, in this corporeal world, is to accept information at the stage of *wahima*, where light dominates. Light has the attribute of dispersion and diffusion which make things visible and invisible respectively. This can be understood from the following example.

Example: Darkness is also a form of light and is thought of as the colour black. The interior of a dark room is not visible initially as one is not acquainted with the light of darkness that is diffused in the room. After some time, when objects become noticeable, it is presumed that the darkness has begun to subside, but in actuality, it has not. Rather, it is the individual who has become accustomed to the light of darkness. The colour black has a tendency to absorb all colours. That is why, when darkness diffuses into the room, it overpowers every shade.

Explanation:
Light is the basis of everything, but despite this, we see objects as separate entities. As in the case of a dark room, one can discern space between different objects. But those very spaces become non-existent when one concentrates on their core, i.e. Light. Awareness of this reality empowers one over time and space. Subsequently, one can then teleport from one place to another in an infinitesimally short amount of time, and they can materialise things as soon as they intend.

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	172
A Conversation with God	Sobia Abbas	167
The Clay Pot and Water	Bibi Anuradha (UAE)	161
Braces, Teeth and I	Sarah Khan	157
Prophet Ezekiel (PBUH)	Extracted	152
The Universe	Dr. Naeem Zafar (Ph.D.)	149
The Traveller and Lamp	Roshan Sitara	144

"If you are irritated
by every rub,
How will your
mirror be polished?"
-Hazrat Jalal al-Din Rumi (RA)

Vol 7 Issue 5 | June 2019 | Ramadan — Shawwal 1440AH

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in chief
Huzoor Qalandar Baba Auliya RA

Chief Editor
Khwaja Shams al-Din Azeemi

Editor
Hakeem Salam Arif

Circulation Manager
Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.70/- Per issue. Annual subscription Rs.950/- with Reg. Post (Domestic), US$ 60/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020